آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

# خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اگست 2019

www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10₹

# ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

## قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
# بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

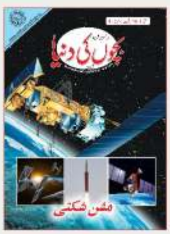
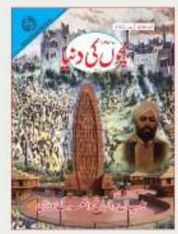

**ان کے علاوہ:**

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

**اور بہت کچھ**

**سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ**

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

# اس شمارے میں


| | | | |
|---|---|---|---|
| اداریہ | مشعل | مدیر | 4 |
| شخصیت | اختر حسین رائے پوری کی افسانہ نگاری | شبنم پروین | 5 |
| نکہت سخن | شاعرات کے منتخب اشعار | | 10 |
| جشن آزادی | تحریک آزادی اور اردو شعراء | قمر جہاں نصیر | 11 |
| | جنگ آزادی میں خواتین کا حصہ | نثار حسن | 16 |
| جہان نسواں | عورت کا بدلتا مقام | ڈاکٹر زیبا ناز | 20 |
| | مرزا فرحت اللہ بیگ کی انشائیہ نگاری | حسن جہاں | 22 |
| | اردو ناول کا معاشرتی بیانیہ | شاہینہ یوسف | 26 |
| | اردو افسانے میں دلت مسائل | نزہت پروین | 29 |
| قانون میں خواتین | خواتین کی ترقی میں مذہب کوئی رکاوٹ نہیں | خواجہ عبدالمنتقم | 35 |
| کہانیاں | حاصل لاحاصل | مسرور جہاں | 40 |
| | خاموشی | ڈاکٹر گل جبین انصاری | 43 |
| حسن سخن | مسعودہ حیات، ثمینہ قمر، حمیرا خاتون | | 51 |
| باورچی خانہ | لذیذ پکوان | | 53 |
| صحت | یہ کھائیں، دورانِ خون بہتر بنائیں | | 55 |
| آرائش وزیبائش | چہرہ کو بارونق بنانے کے آسان نسخے | ڈاکٹر احسان رؤف | 57 |
| تاثرات | نگر نگر سے | | 59 |
| خواتین خبرنامہ | | | 61 |



آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:3 شمارہ: 8 اگست 2019

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

**ناشر اور طابع**

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آراسے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

**صدر دفتر**

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

**شعبۂ فروخت**

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون : 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

# مشعل

’خواتین دنیا‘ کے قارئین کو یوم آزادی مبارک!

ہمارے ملک ہندوستان کو استعماری شکنجے سے آزاد کرانے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے بغیر ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ خواتین کی حصے داری نہ ہوتی تو شاید ملک میں آزادی کا سورج بھی طلوع نہیں ہوتا۔ یہ خواتین کا جذبۂ حب الوطنی ہی تھا جس نے انگریزوں کے ظلم و جبر اور استحصال سے ملک کو نجات دلانے کے لیے آزادی کے جذبے کو بیدار کیا۔ خواتین نے قربانیاں نہ دی ہوتیں تو مردوں کو بھی آزادی کی راہ میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب مجاہدین آزادی جیلوں میں تھے تب یہی خواتین تھیں جنھوں نے تحریک آزادی کا مورچہ سنبھالا اور اپنی شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کیا۔ انگریزوں کے خلاف بڑی بہادری کے ساتھ یہ خواتین لڑتی رہیں۔

جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی بہادری و شجاعت کو کون فراموش کر سکتا ہے۔ جنھوں نے حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک زریں تاریخ رقم کی اور آج ہندوستان کی تاریخ میں رانی لکشمی بائی تحریک حریت کی ایک نمایاں مثال کے طور پر یاد کی جاتی ہیں۔ اسی طرح بیگم حضرت محل کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے جنگ آزادی میں بڑی بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی خواتین تھیں جنھوں نے قومی محاذ آزادی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ کچھ ایسی بھی خواتین تھیں جنھوں نے اپنے بیٹوں کو آزادی کے لیے مہمیز کیا اور حصول آزادی کے لیے ساری صعوبتیں اور مشقتیں بھی برداشت کیں۔ مولانا محمد علی جوہر کی والدہ بی اماں ایسی ہی خاتون تھیں۔

صرف مسلمان خواتین ہی نہیں بلکہ ملک کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین بھی تحریک آزادی میں شامل رہی ہیں۔ جن خواتین نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا ان کے نام آج بھی ہندوستانی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھے جاتے ہیں۔ ایسی خواتین کی بڑی تعداد ہے۔ جنھوں نے جانبازی کی ایک نئی تاریخ مرتب کی۔ ان میں بیگم حضرت محل، بی اماں (آبادی بیگم) کے علاوہ زبیدہ داؤدی، عزیزن بائی، اصغری بیگم، سعادت بانو کچلو، زلیخا بیگم، نشاط النساء بیگم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جب گاندھی جی نے عدم تعاون تحریک اور ہندوستان چھوڑو تحریک کا آغاز کیا تو مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہا اور انگریزوں کے خلاف مزاحمت میں پوری قوت کے ساتھ شریک رہیں۔ ایسی خواتین میں کستوربا گاندھی، ارونا آصف علی، سچیتا کرپلانی وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ صرف تعلیم یافتہ اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین نے ہی تحریک آزادی میں حصہ لیا بلکہ دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والی ان پڑھ خواتین نے بھی جنگ آزادی میں اسی قوت اور جرأت کے ساتھ شرکت کی اور اپنے وطن کو برطانوی استعماریت سے آزاد کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ہمارا ملک ہندوستان ایسی جانباز خواتین کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جنھوں نے ملک میں آزادی، اتحاد، یکجہتی کے لیے ہر طرح کی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کیں۔ ہم ان خواتین کے جذبۂ ایثار و آزادی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

’خواتین دنیا‘ کے اس شمارے میں تحریک آزادی کے تعلق سے کچھ تحریریں شائع کی جا رہی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ چہار دیواری اور حجاب میں رہتے ہوئے بھی خواتین نے ملک کی آزادی میں کتنا اہم اور ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

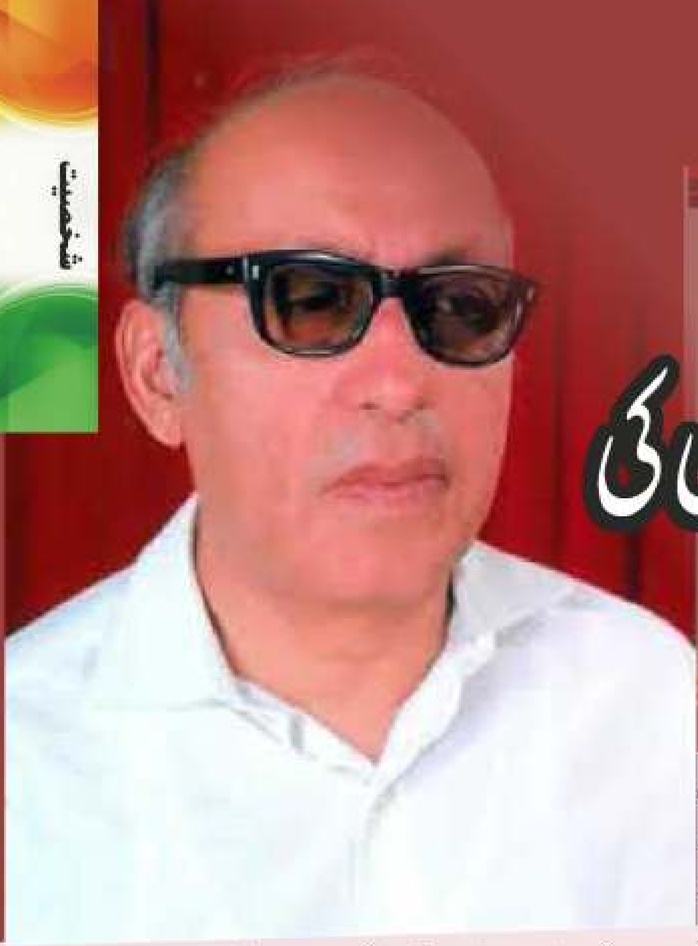

# اختر حسین رائے پوری کی افسانہ نگاری

شبنم پروین

تخلیقی اور تنقیدی تصنیفات کے حوالے سے اختر حسین رائے پوری کی حیثیت مسلم ہے۔ یوں تو وہ ماہر تعلیم بھی تھے، مترجم بھی تھے اور خود نوشت نگار بھی لیکن بطور ناقد اور افسانہ نگار وہ ادب میں اپنی نمایاں اور قابل قدر شناخت رکھتے ہیں۔ ان کا اولین افسانہ نیاز فتح پوری کے مشہور زمانہ رسالہ ''نگار'' (مارچ 1934) میں ''زبان بے زبانی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس افسانے کو نیاز فتح پوری نے تعارفی اور تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا اور رائے پوری کے بالکل نئے انداز اور رنگ کو سراہتے ہوئے اسے اصل افسانے کی روح کہا۔ اردو افسانے کا یہ وہ دور تھا جب سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری جیسے رومانی افسانہ نگاروں کے قلم سست پڑ گئے تھے اور حقیقت نگاری کی طرف کسی کی پوری توجہ نہیں ہوئی تھی۔ اس بڑے خلا کو پر کرنے کی صورت مفقود تھی۔ اس صورت حال میں افسانہ ''زبان بے زبانی'' کی اشاعت نے قارئین کو اچانک ایک بالکل نئے اور حقیقت سے بھرپور افسانوی جہان سے روشناس کرایا۔

اردو میں قصے کہانیوں کی روایت کا سراغ تو بہت پہلے سے ملتا ہے لیکن اصل معنوں میں کہانی یا افسانے کا آغاز ترقی پسند تحریک کے دور میں ہی ہوتا ہے۔ اگرچہ تحریک سے ربع صدی قبل یلدرم کے نیم افسانے بھی ملتے ہیں لیکن اردو میں باضابطہ طور پر افسانے کا آغاز پریم چند کے افسانوں سے ہوتا ہے اس کے بعد ایک طویل سلسلہ ہے جس کا ذکر یہاں مقصود نہیں۔ اختر حسین رائے پوری کا پہلا مجموعہ افسانہ ''محبت اور نفرت'' 1938 میں طبع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ''محبت اور نفرت'' میں تین مختصر تحریروں ''کاغذ کی ناؤ''، ''عورت'' اور ''بچپن'' کو عنوان دینے کے بجائے صرف سوالیہ نشان (؟) سے اس کی نوعیت کو متعین کیا گیا ہے۔ مذکورہ تینوں ادب پارے دراصل افسانہ نگار کے باطن میں موجود تین اہم مسائل اور سماجی عوامل کو آشکار کرتے ہیں۔ ان میں افسانہ نگار کے ردعمل سامنے آتے ہیں جن سے اس کی ابتدائی نظریے کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس حصے کا ہر عنوان اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عمر کے مخصوص حصے میں بالغ ہوتا ہوا ذہن ان تمام حقائق کو اپنے طور پر سمجھنا اور نئے عنوانات دینا چاہتا ہے۔ ''نفرت'' کے تحت سات کہانیاں موجود ہیں۔ اس حصے کا سرعنوان ''نفرت ایک سوگھنے کے لیے'' اس جذبے کی تصدیق ہے جس جذبے کی طرف ابھی اشارہ ہوا ہے۔ ان افسانوں میں نفرت کو بیشتر محبت کی تفہیم پر مبنی واقعات کی مدد سے واضح کیا گیا ہے۔ اس سے قبل کہ ان افسانوں پر تفصیل سے گفتگو ہو ان افسانوں کے متعلق خود افسانہ نگار کے خیالات اور افکار سے واقفیت لازمی ہے۔ اپنے افسانوں کے متعلق اختر حسین رائے پوری اپنی تمہید میں لکھتے ہیں:

''نفرت کے باب میں جو افسانے آتے ہیں وہ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ اس زمانہ کی حقیقت صرف ظلم اور مظلومیت کی

کشاکش میں پنہاں ہے آج کائنات کا ذرہ ذرہ انہیں دو خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ جان بوجھ کر یا ان جان پنے سے، دانستہ یا نادانستہ ہر ادیب یا تو ظلم کا طرفدار ہوتا ہے یا مظلوم کا ہم دم۔ جب میں اپنے آس پاس اندھے بھکاریوں، ننگی طوائفوں اور فاقہ کش مزدوروں کا انبوہ دیکھتا ہوں اور جب ان کی فریاد کو اخلاق کی بلند بانگ اذان سرمایہ داری کے پیروں تلے روندنے لگتی ہے تو میں ہرگز چپ نہیں رہ سکتا۔“

(محبت اور نفرت (تمہید) اختر حسین رائے پوری۔ ص 7)

اختر حسین رائے پوری نے اپنے افسانوں کا مزاج اور موضوع ظاہر کرکے یہ واضح کردیا ہے کہ ان کے افسانے عام افسانوں کی طرف محض دل بستگی خاطر کے لیے نہیں ہیں بلکہ ان میں زندگی کے سوز اور رنج ومحن کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ انھوں نے مجموعہ افسانہ ”محبت اور نفرت“ کو جیسا کہ عرض کیا گیا ہے تین حصوں میں بالترتیب ”محبت“ اور نفرت“ کے عنوان سے شامل کیا ہے۔ ان مشمولہ سولہ افسانوں کی فہرست یہ ہے۔

1۔ زبان بے زبانی، 2۔ منزل ناتمام، 3۔ یوں ہوتا تو کیا ہوتا
4۔ سمندر، 5۔ میرے خوابوں کا مندر 6۔ وہ دونوں
1۔ کاغذ کی ناؤ، 2۔ عورت، 3۔ بچپن
1۔ زلزلہ، 2۔ میرا گھر، 3۔ اندھا بھکاری، 4۔ مجھے جانے دو
5۔ موت، 6۔ مرگھٹ، 7۔ میری ڈائری کے چند ورق

اس کے ابتدائی چھ افسانے ”محبت“ کے باب میں آتے ہیں اس باب کا پہلا افسانہ ”زبان بے زبانی“ ہے اس کے علاوہ بقیہ جو افسانے ہیں وہ محبت نامرادی اور محرومی و کشاکش سے عبارت ہیں۔ ان افسانوں کے متعلق ظہورالحسن ڈار نے لکھا ہے کہ:

”ان افسانوں میں ایک بے قرار روح کا کرب، ایک ناتمام تمنا کا سوز ہے جو ناظر کے دل میں گہرا غوطہ لگا کر آنسوؤں کے موتی چن لاتا ہے۔ ان افسانوں میں زبان بے زبانی، یو ہوتا تو کیا ہوتا اور منزل ناتمام بڑے معرکے کی چیزیں ہیں۔ ”زبان بے زبانی“ کا ہیرو برگد کا ایک بوڑھا درخت ہے جو اس جہان بے ثبات سے چلتے چلاتے اپنی بیزبانی سے انسانی محبت کی داستان سناتا ہے اور اپنے مشاہدے اور فکر کے میل سے ایک ایسی پرسوز کہانی مرتب کرتا ہے جو ناظر کے دل میں محبت کی طرف سے بدگمانی پیدا کردیتی ہے۔ وہ محبت کی پاکیزگی اور رعنائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہے مگر اس کا مشاہدہ بتلاتا ہے کہ محبت کا انجام بربادی کے سوا کچھ نہیں، وہ خود بھی اپنے سینے سے لپٹی ہوئی نیلی امربیل سے محبت کرتا ہے۔ اس کے بوسوں کی لذت میں مسرور رہتا ہے مگر اس کے دل میں یہ کھٹک موجود ہے کہ آخرکار یہ محبت میری زندگی کا رس چوس لے گی اور یہی محبوب ”امربیل“ ایک دن میرے خاتمے کا عنوان لکھے گی۔۔ اس کا مشاہدہ آنکھوں سے دو تین مرتبہ انجام محبت دیکھتا ہے اور اپنی قسمت کو سراہتا ہے کہ وہ انسان نہ ہوا، ورنہ اس کی محبت کا بھی وہی حشر ہوتا جو اس عورت کا ہوا جس نے مرتے وقت کہا۔

”دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا، انسان کے رحم وکرم سے میں محروم ہوچکی ہوں۔ میں نے بے وفائی کی، احسان فراموشی کی، کس امید پر محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی، محبت، فریب، مکر، دھوکا! اس ظالم نے مجھے دین ودنیا کہیں کا نہ رکھا۔ مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے۔ دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامن عاطف میں جگہ دوگے، جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہ عظیم کا بار لے آئی ہوں۔ ایک ایسے بچے کی ماں ہوں جس کا باپ بننے پر کوئی تیار نہیں دیوتا کیا تم میرے گناہوں سے درگزر کروگے.............کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا نے پیدا کیا تھا اور اس بچے کو؟ اس بچے کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے؟ خیر میں ہی سہی لیکن میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائے گا۔ خدا رحیم وکریم ہے۔ شاید مردوں کے لیے، لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے؟ خدا، جنت، روح، دنیا، عاقبت، سب مردوں کے لیے.............آہ میرا بچہ! میرا بچہ!!“

(اختر حسین رائے پوری۔ ظہورالحسن ڈار، افکار کراچی، مئی 1986۔ ص 189)

(زبان بے زبانی، محبت اور نفرت۔ اختر حسین رائے پوری۔ ص۔ 2-22)

مندرجہ ذیل اقتباس میں کہانی کے مرکزی کردار میں اس عورت کا صرف یہ گناہ تھا کہ اس نے محبت پر یقین کیا محبت کو اپنایا اور زندگی جینے کی کوشش کی لیکن اسے برگد کی آغوش میں اپنے معصوم بچے کے ساتھ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ افسانہ نگار کے مطابق اس عورت اور اس کے نوزائیدہ بچے کی موت کا سبب مرد کا سفاکانہ اور ہوسناکی سے بھرپور رویہ تھا یا مردوں کے تفوق والا معاشرہ تھا جس نے اسے زندگی سے ہاتھ دھونے پر مجبور کیا۔ ساتھ ہی اس عورت کے ساتھ ایک معصوم کو بھی سزا ملی

جسے کچھ معلوم بھی نہ تھا اس کا صرف قصور یہ تھا کہ وہ اس عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔

اس افسانے کو افسانہ نگار نے بہت ہی مشاقی اور ہنر مندی کے ساتھ ایک عمدہ ترین فن پارہ بنا دیا ہے۔ کہانی میں کہیں بھی وعظ و نصیحت نہیں ہے اور نہ ہی ہندوستانی معاشرہ کے متوازی کوئی فلسفہ حیات تجویز کیا گیا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کا خاصہ یہ ہے کہ وہ صورت حال کو سامنے رکھتے ہیں۔ وہ سماجی برائیوں کو ختم کرنے اور مسائل کو حل کرنے کے لیے کوئی تقریر نہیں پیش کرتے بلکہ صرف سچی تصویر پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین خود اس پر غور و خوض کریں اور اس کے سدباب کی سبیل کے متعلق سوچیں۔ افسانہ ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' تقریباً ''زبان بے زبانی'' کا ہی حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ''زبان بے زبانی'' میں اس نے ایسی عورت کو دیکھا جو سماج کی ساری پابندیاں توڑ کر اپنے محبوب سے جا ملی مگر انجام کار اسے کچھ نہ ملا اور واپسی پر مجبور ہونا پڑا لیکن ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' میں وہ ایک ایسی لڑکی کا ذکر کرتا ہے جس نے محبت کی آگ میں جلنا پسند کیا مگر معاشرے کے بندھن کو توڑ کر اپنے محبوب سے جا ملنے کی اس میں ہمت پیدا نہ ہو سکی۔ اس لیے وہ جانتی تھی کہ اس ملن کا آخری نتیجہ کیا ہوگا۔ اسے ایک بدنصیب اور ہرجائی کی موت مرنا ہوگا۔ دنیا اصل ہرجائی اور دھوکے باز کو معاف کر دے گی لیکن اس کی سچائی اور وفاداری پر یقین نہیں کرے گی۔ اس لیے کہ اس دنیا پر مردانہ سماج کا تسلط قائم ہے۔ اس لیے بہر حال سارے فیصلے اسی کے حق میں ہوتے ہیں اور مظلوم لائق سزا ٹھہرتا ہے۔

اختر حسین رائے پوری کی کہانیاں زندگی کے دو ہی احساسات یعنی نفرت اور محبت کے گرد طواف کرتی ہیں۔ انسان کے دل کی گہری تاریکی میں یہ احساسات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ محبت زندگی میں ایک خوشگوار جھونکے کی مانند آتی ہے اور روح تک کو معطر کر جاتی ہے اور زندگی حسین سے حسین تر معلوم ہونے لگتی ہے۔ جبکہ نفرت زندگی کی وادی میں ایک زہریلی ہوا کے طور پر داخل ہوتی ہے اور انسان کو غم و اندوہ اور مضطرب و بے قرار کر جاتی ہے۔ انسان اپنی فطرت اور سرشت سے مجبور ہو کر محبت کے دام میں پھنس جاتا ہے لیکن فوراً ہی اس کا سامنا سماج کی زہر آلود نگاہوں سے ہوتا ہے اور بالآخر اسے قربان گاہ تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ سماج کا رویہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا ہر زمانے میں جواب مانگا جاتا ہے لیکن جواب مانگنے والی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے۔ اس کی ذمہ داری ہمارے معاشرے پر ہے۔ مرد تو خیر خدا کا خلیفہ تصور کیا جاتا ہے مگر عورت ایک حقیر شے بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے گناہ ناقابل معافی ہوتے ہیں۔ اگر عورتوں کے ساتھ انصاف ہوتا تو ان کو بھی مساوی حقوق حاصل ہوتے اور انھیں ذلت و رسوائی کی زندگی سے نجات مل جاتی اور وہ بھی عزت و وقار کی زندگی جینے کی حقدار بن جاتی اس طرح اس افسانے کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے سماج میں محبت گناہ ہے اور اس کی سزا جہنم کی آگ سے بھی زیادہ تکلیف دہ اور خوفناک ہے۔

اس کہانی کی مرکزی کردار ہر وقت سوچتی ہے کہ ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' کاش وہ ایسا کر سکتی۔ کاش اس کے اندر اتنی سکت اور ہمت ہوتی تو مردوں کی طرح وہ سب کچھ ممکن کر دیتی جو مرد کرتے ہیں۔

اختر حسین رائے پوری کا فن ایک عجیب قسم کی پرسوز موسیقی کی طرح ہے۔ وہ ایک ساتھ مسرت اور غم کو آپس میں مدغم کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے یہاں دل لبھانے والی کیفیت بھی موجود ہے اور حزن و ملال کی کیفیت گزارنے کا ملکہ بھی ہے۔ ان کے یہاں نفرت ہو یا محبت ہر احساس اپنی پوری شدت اور توانائی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ وہ ایک اہم اور بڑے افسانہ نگار ہیں اور ان کی انسانی زندگی کے ہر پہلو پر عمیق نظر ہے۔ ان کے افسانوں میں جہاں مایوسی، محرومی اور نفی کی صورت ابھرتی ہے وہاں اس بات کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کے بڑے علمبردار ہیں اور خلوص نیتی ان کی فطرت ثانیہ ہے۔

اس مجموعہ افسانہ میں نفرت کے باب میں جو افسانے موجود ہیں ان میں ''مجھے جانے دو'' ''مرگھٹ'' اور ''میرا گھر'' بہت ہی اثر انگیز اور بہترین ہیں۔ یہ تینوں افسانے ہندوستانی سماج کے حقیقی آئینہ دار ہیں۔ کھرے کھوٹے کی پہچان رکھنے والے ناقد ہیں۔ اردو میں بہت سے ایسے افسانہ نگار موجود ہیں جنھوں نے زندگی کو گہرائیوں میں اتر کر اسے موضوع بنایا ہے جو ہر وقت ذلت رسوائی اور تحقیر کا ہدف رہا ہے۔ لیکن خیالات کے الجھاؤ اور اظہار خیال کی ژولیدہ بیانی نے انھیں سچائی لکھنے سے روکا ہے۔ اردو ادب میں طوائفوں کو اکثر موضوع بنایا جاتا رہا ہے اور اس کا کردار اکثر ہرجائی اور بدچلن کے طور پر سامنے آیا ہے۔ لیکن اختر حسین رائے پوری کی کہانی ''مجھے جانے دو'' کی ہیروئن جو دوسری طوائفوں سے بالکل منفرد ہے۔ اس کے پاس مردوں کو لبھانے اور ان پر محبت لٹانے کا حربہ نہیں بلکہ اس کے پاس اپنے شناساؤں کے لیے نفرت ہی نفرت ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور یہ سب صرف مردوں کے لیے ہے۔ ان مردوں کے لیے ہے جو شب کی تاریکی میں دبے پاؤں اس کے پاس آتے ہیں۔ داد عیش دیتے ہیں اور وہاں سے نکل کر نہایت ہی نفرت اور حقارت سے کہتے ہیں:

''ان کلکتی طوائفوں کو عصمت و عزت کا ذرا بھی پاس نہیں۔

انہیں شہر سے باہر نکال دینا چاہیے"

(مجھے جانے دو (مجموعہ محبت اور نفرت) اختر حسین رائے پوری۔ ص ۔163)

آخر ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ بے بس اور لاچار عورت ہے جسے خود سماج نے ہی عصمت فروش اور ہر جائی بننے پر مجبور کیا ہے۔ کئی خوفناک بیماریاں، اس کے جسم کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی ہیں۔

اس کہانی میں اختر حسین رائے پوری نے جس بیباکی اور جرأت کے ساتھ اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا ہے وہ جرأت اور بے باکی ان کے زمانے میں اس طرح عام نہ تھی۔ جب قارئین کی نظر سے یہ افسانہ گزرتا ہے اور نفرت سے بھرے ہوئے خطرناک ارادے کا احساس ہوتا ہے تو وہ کانپ جاتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کسی کی زندگی کا تانا بانا بننے کا ذمہ دار کون ہے؟ عورت یا خود سماج؟ پھر ان کو نفرت کی نگاہ سے کیوں دیکھا جاتا ہے ایسا صحت مند ماحول کیوں نہیں ساز گار کیا جاتا جس میں طوائفوں کو اس مقام تک نہیں پہنچنا پڑتا۔ اس کہانی میں اختر حسین رائے پوری نے بہت ہی ہنر مندی اور چابکدستی سے افسانوں کے کرداروں کو جیتا جاگتا اور جاندار بنا دیا ہے۔ ان کے کردار اپنے حرکات و اعمال میں بالکل اپنے محسوس ہوتے ہیں جیسے کہ وہ ہمارے ارد گرد موجود ہوں۔ ان کی افسانوی خصوصیات کو اجاگر کرتے ہوئے ظہور الحسن ڈار نے اعتراف کیا ہے کہ:

"اردو ادب میں ایسے کرداروں کی کمی ہے جنھیں زندگی دوام حاصل ہو سکے۔ مگر جب اختر رائے پوری کے افسانے دیکھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے کہ اردو ادب اس معاملے میں بالکل کنگال نہیں۔ بلکہ اس کی جھولی میں ایسے ہیرے بھی ہیں جو ادب کی منڈی میں غیر ملکی جواہر ریزوں سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔"

(اختر حسین رائے پوری، ایک جائزہ۔ افکار کراچی۔ ممبئی ۔1986 صفحہ 201)

اختر حسین رائے پوری کی کہانی "موت" ہوس پرست مردوں کے ظلم وستم اور جبر واستبداد کی لامتناہی داستان ہے جس میں مردانہ سماج کی سیاہ کاریوں کو نشانہ بنایا گیا ہے اور عورت کو ایک بے بس، مجبور اور مظلوم کردار میں پیش کر کے اس کے لیے ہمدردیاں جتانے کا کام کیا گیا ہے۔

یوں تو اختر حسین رائے پوری کے زیادہ تر افسانے اسی مذکورہ محبت اور نفرت کے احساسات کے گرد گھومتے ہیں لیکن ان کی کہانی "مرگھٹ" کا موضوع سیاسی زندگی ہے۔ اس مختصر سے افسانے میں افسانہ نگار نے بڑی ہی فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ انقلابی تحریکوں کے دوران لوگوں کی ذہنی کشمکش کو آئینہ کر دیا ہے۔ اس کہانی سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس میں عام انسانی ذہن پر سرکاری عتاب کا گہرا نقش نظر آتا ہے اور مرگھٹ ایک استعارہ بن کر سامنے آتا ہے:

"اسی مرگھٹ میں لوگ ایک لاش کو جلانے آئے ہیں۔ آپ بھی دل کڑا کر کے اس جلتی ہوئی لاش کا نظارا دیکھئے............چتا تیزی سے جلنے لگی۔ دو آدمی لمبے لمبے بانسوں سے لاش کو ادھر ادھر لوٹانے لگے، گوشت کے ادھ جلے ٹکڑے اڑ اڑ کر زمین پر گر پڑے تھے اور شعلے کتوں کی طرح ہڈیوں کو جبڑے میں دبا کر چٹخارے بھرتے اور بے بصر آنکھوں سے ہر طرف گھورتے تھے۔ اندھیرا ہو چلا تھا، بادلوں کے دو چار گلابی ٹکڑے اڑ رہے تھے اور ایک دو تارے تیروں کی نوک کی طرح آسمان سے پیوست تھے ہر طرف سناٹا تھا ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہ آتی تھی۔"

(کہانی "مرگھٹ" (محبت اور نفرت) اختر حسین رائے پوری۔ ص180)

'زندگی کا میلہ' اختر حسین رائے پوری کا دوسرا مجموعہ افسانہ ہے۔ اس میں آٹھ افسانے شامل ہیں یہ سارے افسانے جنگ عظیم (Second World war) کے دوران لکھے گئے تھے۔ ان افسانوں میں بھی افسانہ نگار کی وہی بیزاری تلخی اور طنز کی کاٹ ہے جو ان کی شناخت ہے۔ البتہ ایک تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ اس میں عمر، زمانہ اور تجربے کی پختگی پہلے سے زیادہ نظر آتی ہے۔ سنجیدگی اور متانت سے حالات کی تفہیم کرنا اور اسے فن کے پیرائے میں پیش کرنا ایک ایسا خاصہ ہے جو ان افسانوں میں جا بجا محسوس کیا جا سکتا ہے۔ "محبت اور نفرت" کے افسانوں میں ایک ایسی تڑپ ہے جو انسانی وجود کو پوری طرح جھنجھوڑ دیتی ہے۔ لیکن "زندگی کا میلہ" کے افسانوں میں تڑپ بہت ہی احتیاط اور ضبط کے ساتھ منظر عام پر آتی ہے۔ ان افسانوں پر تذلیل انسان اور انسانیت پر سوز دروں کی کیفیت حاوی ہے جس میں بیزاری، کڑواہٹ ہے مگر ابال اور شدت آمیزی نہیں ہے۔ اس کیفیت کی بہترین مثال ان کا ایک افسانہ 'بیزادی' ہے اس میں صورت حال اور لب ولہجہ کی تبدیلی کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"میں جس پل پر کھڑا ہوا تھا اس کی محرابوں میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں اور اس کے نیچے جو دریا بہتا تھا اس کا پانی مٹ میلا اور کثیف تھا۔ میں صرف اس لیے کھڑا ہوا کرتا تھا کہ اپنے آپ سے بھاگ کر انسانوں کی بھیڑ میں گم ہو جاؤں اس طرح مجھے یاد بھی نہ رہے کہ میرا نام کیا ہے؟ تصوف کی کوئی

> خاص کیفیت طاری کر کے میری وحدت اس کثرت میں گم ہو جائے تو میں ایک بہت بڑے عذاب سے نجات پا جاؤں۔
> ایک ایسا عذاب جو گھن کی طرح میری روح کو چاٹ رہا ہے اور اس کے ہونٹوں کا لمس میرے دل کی دھڑکن کو بند کر کے آسمانی کتوں کی طرح چٹخارے بھر رہا ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباس کے ذریعے افسانہ نگار نے اپنے عہد کی ساری سماجی کیفیتوں اور ان کیفیتوں کے دھارے پر اپنے دور کے آدمی کی پوری ذہنی، نفسیاتی اور روحانی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ اس مجموعہ کے دوسرے افسانوں میں بھی یہی صورت حال نظر آتی ہے لیکن اختر حسین رائے پوری کے یہاں حالات کی ناموافقت کے باوجود وہ مایوسی اور کڑھن نہیں جو قاری کو دائمی محرومی میں مبتلا کر دے۔ اس کے یہاں مایوسی اور ناگفتہ حال میں بھی امید کی کرن موجود ہے۔ افسانہ "بیزاری" کے علاوہ "دل کا اندھیرا"، "جسم کی پکار" اور "پتھر کی موت" میں ان کی فطری بیزاری محسوس کی جا سکتی ہے۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اختر حسین رائے پوری کے دونوں افسانوی مجموعہ کے افسانے درد، کرب اور گہرے و سنگین مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں دکھی اور مضمحل روح کی چیخ ہے جو اپنے چاروں جانب لہولہان معاشرے کی سچی تصویر پیش کرتی ہے۔ ان کے مذکورہ دونوں افسانوی مجموعوں کے علاوہ نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی نے بھی ایک مجموعہ "ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے افسانے" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس بابت اظہار خیال کرتے ہوئے مرتب چودھری طارق اقبال گاہندوی نے عرض ناشر کے تحت لکھا ہے کہ:

> "اردو افسانے کی تاریخ میں جن دو چار افسانہ نگاروں کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے ان میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بھی شامل ہیں۔ وہ اردو کے ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے افسانے کا رشتہ حقیقی زندگی سے جوڑا ہے۔ اسے رومانویت کی طلسمی فضا سے باہر نکالا اور زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے کے لائق بنایا۔ اردو افسانے کی تاریخ میں ڈاکٹر صاحب کی افسانہ نگاری زریں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔"

(ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے افسانے۔ ناشر طارق اقبال گاہندوی 1989۔ ص 5)

اختر حسین رائے پوری کی افسانوی خصوصیات کو اجاگر کرتا ہوا یہ اقتباس انھیں بہت سے افسانہ نگاروں کے درمیان ممتاز و ممیز قرار دیتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری کے افسانوں کے اسلوب انداز بیان اور موضوعات اپنے آپ میں نہ صرف یہ کہ اپنی علاحدہ انفرادیت اور شناخت رکھتے ہیں بلکہ یہ اپنے دور کے سفید و سیاہ کو بہت ہی جرأت اور بے باکی کے ساتھ پیش کرنے میں بھی کامیاب ہیں۔ اپنے افسانوں کے متعلق خود اختر حسین رائے پوری نے وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

> "لوگ کہتے ہیں کہ زمانے کا چلن بدل گیا اور اب نئے لوگ پرانی چیزیں نہیں پڑھتے۔ معلوم نہیں اس قیاس میں کتنی صداقت ہے۔ کیونکہ ادب میں نئی اور پرانی کی تمیز بیجا ہے۔ اگر انسانی تہذیب میں ہر نسل کے ساتھ تجربے اور معیار کا تسلسل ٹوٹتا جائے تو زندگی میں انتشار کا وہی عالم ہوگا جس کا تماشہ اب ہم دیکھنے لگے ہیں۔ میں تخلیقی تحریر میں اسلوب کی اہمیت کا قائل ہوں اور قاری محسوس کرے گا کہ موضوع کے لحاظ سے میرا انداز بیان بدل جاتا ہے اس کی ضرورت کیوں پیش آئی کہ میرے افسانوں کے ماحول میں تنوع زیادہ ہے جس کی وجہ میرے حالات کے نشیب و فراز ہیں۔"

(دیباچہ۔ اختر حسین رائے پوری کے افسانے۔ مرتبہ طارق اقبال گاہندی۔ ص 8)

اختر حسین رائے پوری کے مندرجہ بالا اقتباس سے ان کے مزاج اور ان کے فن کے متعلق آگاہی ہوتی ہے اور ان کے معاصر افسانہ نگاروں کے درمیان ان کے مرتبے کے تعین میں آسانی ہوتی ہے۔

## حوالے


(1) "محبت اور نفرت" (تمہید) اختر حسین رائے پوری۔ ص ے

(2) اختر حسین رائے پوری۔ ظہور الحسن ڈار، افکار کراچی مئی 1986۔ ص 189

(3) زبان بے زبانی، محبت اور نفرت۔ اختر حسین رائے پوری۔ ص ۔ 21-22

(4) مجھے جانے دو (مجموعہ محبت اور نفرت) اختر حسین رائے پوری۔ ص۔ 163

(5) اختر حسین رائے پوری، ایک جائزہ۔ افکار کراچی۔ ممبئی۔ 1986 ص 201

(6) کہانی "مرگھٹ" (محبت اور نفرت) اختر حسین رائے پوری۔ ص 180

(7) ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے افسانے۔ ناشر طارق اقبال گاہندی 1989۔ ص 5

(8) دیباچہ۔ اختر حسین رائے پوری کے افسانے۔ مرتبہ طارق اقبال گاہندی۔ ص 8


❑❑❑


**Dr. Shabnam Parween**
Vill. Tola Hardia Karbala
Post Office Hardia
Thana & Block Barharia
Dist. Siwan-841232 (Bihar)

# شاعرات کے منتخب اشعار

برباد و پائمال ہوں زخمی جگر ہوں میں
پھر بھی تری نظر میں کہاں معتبر ہوں میں

دیکھوں تو اک مجسمۂ بے زبان و دل
سمجھو تو ایک معرکۂ خیر و شر ہوں میں

ام ہانی

ہوا کے زہر نے سینچا ہے میرا ذوق نمو
تمام تازہ ہواؤں سے نسیم جاں ہوں میں

خزاں کے بیج زمینوں میں بو کے بیٹھے ہیں
اور انتظار کسی موسم بہار کا ہے

نسیم سید

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی عجب تھی

ایک مشت خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

پروین شاکر

کیسر خوں کا پیلا رنگ پھولوں میں نمایاں ہے
ان ہی شاخوں پہ آئیں گے ثمر آہستہ آہستہ

یہ وقت کی سازش ہے کہ سورج کی شرارت
سائے مری دیوار کے اس پار بہت ہیں

سکینہ ساجد پنہاں

یہ غم نہیں کہ میں پابندِ غم دوراں تھی
رنج یہ ہے کہ مری ذات مرا زنداں تھی

کپاس چنتے ہوئے ہاتھ کتنے پیارے لگے
مجھے زمیں سے محبت کے استعارے لگے

عشرت آفرین

پہچان مری گھر سے نہیں ہجرتوں سے ہے
یہ المیہ بھی ہونے لگا مجھ پہ فاش پھر

یہ جال پھیل رہا ہے مری ہتھیلی پر
کہ ہجرتوں کا حوالہ ہے میری قسمت سے

حمیرا رحمٰن

زندگی تجھ سے تو پانا تھا ہمیں آب حیات
زہر کیسا یہ رگ و پے میں اترتا جائے

بکھر چکے ہیں صحیفے پرانی قدروں کے
ڈھلے ڈھلے سے ہیں احترام کے سائے

ملکہ نسیم

میں کہ اپنی ذات میں اک پیاس کا صحرا رہی
کارواں در کارواں گزری مگر تنہا رہی

خوابوں کی دیوار ہی گر گئی آنکھ کھنڈر کا رونا کیا
سارے بدن میں ہو کا عالم دل کے نگر کا رونا کیا

شہناز نبی

قمر جہاں نصیر

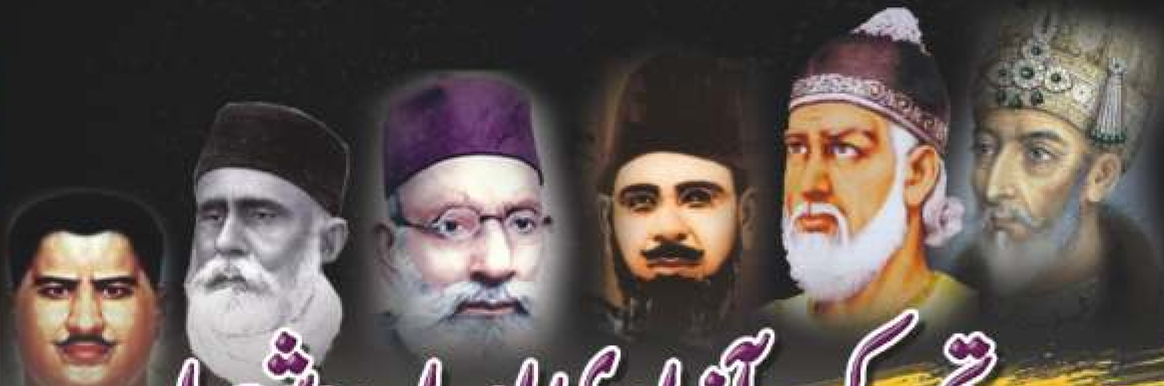

# تحریک آزادی اور اردو شعراء

ہندوستان کی تحریک آزادی تاریخ عالم میں موجود بہت سی دیگر جنگوں کی طرح چند سالوں کے دورانیے پر مشتمل کوئی جنگ نہیں تھی جس میں پسپائی کے بعد غاصب انگریز ہندوستان چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے بلکہ تاریخ ہند میں تحریک آزادی تو اس مسلسل جدوجہد کا نام ہے جو 1757 میں بنگال کے نواب سراج الدولہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی سے ٹکراؤ کی شکل میں شروع ہوتی ہے۔ عام طور پر ہم جنگ آزادی کا تذکرہ 1857 سے کرتے ہوئے ان شہیدوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جنھوں نے اس سے قبل انفرادی یا اجتماعی کوششوں میں لہو کا خراج ادا کیا۔

آزادی کی اس طویل جدوجہد کو اگر ہم سو سال پیچھے لے جائیں تو یہ ان شہداء کے خون کو نذرانہ پیش کرنے کی ایک معمولی سی کوشش ہوگی جنھوں نے پلاسی، بکسر، اینگلو میسور، اینگلو مراٹھا اور اینگلو سکھ اور ان جیسی کئی جنگوں میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور کبھی ویلور کی بغاوت، سنیاسی بغاوت اور پنڈاری بغاوت کی شکل میں وقتاً فوقتاً اس وسیع و عریض ملک کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنے زندہ ہونے کا ثبوت دیتے رہے۔ جس کے ایک سرے پر اگر یہ تاریخی جملہ ہے کہ ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے“ تو اس کے دوسرے سرے پر 1930 میں پہلی گول میز کانفرنس میں انگریزوں کے سامنے کہے جانے والے یہ جملے کہ

”ہمیں تجاویز کی ضرورت نہیں اور نہ اس بات کی پرواہ ہے کہ آپ ہمارے لیے کس قسم کا آئین تیار کرتے ہیں ہمیں انسانوں کی ضرورت ہے کاش سارے انگلستان میں ایک بھی فرد ہوتا جو انسان کہلانے کا مستحق ہوتا۔ میں ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے لندن آیا ہوں اور آزادی کا پروانہ لے کر ہی واپس جانا چاہتا ہوں میں ایک آزاد ملک میں تو مرنا پسند کروں گا لیکن غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔“

(محمد علی جوہر)

اردو شعر و ادب میں 1857 سے پہلے بھی غیر ملکی طاقت اور خاص کر برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں کے خلاف نفرت انگیز جذبہ دیکھنے کو ملتا ہے تاہم اٹھارویں صدی کے نصف اول تک جب تک برطانوی سماج کی تجارتی اور زراعتی پالیسیوں میں خود غرضی اور ظلم کی لو اپنی انتہا تک نہیں پہنچی تھی ہمارا سیاسی شعور بھی اتنا بالیدہ نہیں ہوا تھا۔ 1857 تک پہنچتے پہنچتے پورا ملک یا تو براہ راست تاج برطانیہ کے زیر اقتدار تھا یا سبسڈری الائنس کے تحت بالواسطہ برطانیہ کے زیر نگیں آچکا تھا۔ ہندوستانی اپنی ہی سرزمین پر دوسرے درجے کے شہری بن چکے تھے اور اسی ذلت نے ان کی غیرت کو بیدار کیا۔ 1857 کی بغاوت جہاں حکمراں اور زمیندار طبقے کے لیے اپنی کھوئی ہوئی ریاست اور زمینوں کی بازیابی کے لیے کی جانے والی جنگ تھی وہیں عوام الناس کے دلوں میں انگریزوں سے آزادی کی پنپتی ہوئی خواہش کا عملی اظہار تھی۔ ان عوام الناس میں اردو شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے بھی تھے جنھوں نے قلم سے ہتھیار کا کام لیا۔ اردو کے یہ شعراء اگرچہ کسی ملکی

یا منظم قومی جذبے سے ناآشنا تھے تاہم سرزمین ہندوستان پر غیر ملکی لوٹ کھسوٹ سے بے چین تھے۔ 1857 کی بغاوت سے بہت پہلے مصحفی کا یہ شعر کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک گہرے سیاسی شعور کا رچاؤ نظر آتا ہے:

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر لوٹ لی

1857 کی بغاوت ہماری سیاسی تاریخ میں ایک نیا موڑ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ جنگ کسی منظم پیمانے پر نہیں لڑی گئی اور یہ بھی سچ ہے کہ بعض طبقوں نے صرف شرکت سے ہی گریز نہیں کیا بلکہ سامراجی طاقتوں کا ساتھ دیا۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ پہلی جنگ ہے جو ہندوستانی سپاہیوں اور عوام نے انگریزوں کے خلاف پہلے کے بالمقابل وسیع پیمانے پر لڑی۔ انگریز غالب ضرور آئے بغاوت کو طاقت کے زور پر کچل دیا گیا تاہم آزادی کی اس ناکام کوشش نے عوام کے ذہنوں میں احساس آزادی کو بیدار کیا اور اس کے لیے منظم پیمانے پر کوشش کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا یہاں تک کہ چشم فلک نے وہ دن بھی دیکھا کہ جس لال قلعے سے بے دخل کر کے ایک پیرانہ سال معزول شہنشاہ کو برما کی طرف بھیجا گیا تھا وہیں 1947 کی 14 رویں اور 15 رویں اگست کی درمیانی شب میں ہندوستانی جھنڈا لہرایا گیا اور نوے سال قبل جلاوطنی کے فرمان پر دستخط ثبت کرنے والے اپنی بے دخلی کے تابوت میں بدستِ خود آخری کیل ٹھونک رہے تھے۔ 1857 کی اس جدوجہد میں عوام الناس کے ذہنوں میں آزادی کی جوت جگانے میں ادبا وشعراء کا نمایاں کردار رہا ہے۔ ان شعراء نے نہ صرف یہ کہ قلم سے تلوار کا کام لیا بلکہ ان میں سے بعض نے عملی طور پر بھی جنگ میں حصہ لیا۔ اس بغاوت سے کافی پہلے ہی اردو شاعری میں انگریزی حکومت کے خلاف دشمنی کا اثر بڑھنے لگا تھا۔ شمالی ہند اس بغاوت کا مرکز رہا اور شمالی ہند کے دو بڑے شہر دہلی اور لکھنؤ اردو شعر وادب کے دو نمائندہ مراکز تھے۔ متعدد شعرا نے قربانیاں دیں۔ قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں۔ آزاد کی گرفتاری کا وارنٹ ہو یا حالی کے لٹنے کا واقعہ۔ منیر شکوہ آبادی کی سزائے حبس دوام ہو یا امام بخش صہبائی کا قتل یا شیفتہ کی انگریز دشمنی۔ دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے بعد شیفتہ معتوب دربار ٹھہرے نہ صرف جاگیر ضبط ہوگئی بلکہ ابتدائی عدالت نے سات سال قید کی سزا سنائی حالانکہ بعد میں اپیل کرنے پر بری قرار دیے گئے۔ صدرالدین آزردہ کی ملازمت موقوف اور جائداد واملاک برباد۔ ان صدموں سے آخری ایام بڑی تلخی سے بسر ہوئے۔ صرف یہی نہیں کہ باغی عوام میں اردو کے اہم شعراء شامل رہے بلکہ اس ہنگامے کے بعض بڑے لیڈر بھی شاعر تھے جن میں سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا نام سب سے اہم ہے۔ ہندوستان کے اس بدنصیب بادشاہ کو دوسرے تمام باغیوں کی طرح نہ تو گولیوں سے اڑایا گیا اور نہ ہی سولی پر چڑھا کر اسے قید فرنگ اور قید زندگی سے آزاد ہونے کا موقع عنایت کیا گیا بلکہ اس کے نوشتہ تقدیر میں جلاوطنی کے کربناک شب وروز رقم کردیے گئے اور رنگون کی اجنبی سرزمین پر ڈال دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر کا ایام غدر میں کہا ہوا کلام دستیاب نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حکیم احسن اللہ خان کے حوالے کردیتے تھے جنھوں نے ضائع کردیا۔ تاہم غدر سے قبل کے کہے ہوئے کلام پر ایک نظر:

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا
پابہ زنجیر اور دیوانہ ہے آیا کون سا
یہ نہیں معلوم پر زنداں میں غل برپا تو ہے
دشتِ وحشت کو ارادہ ہے کہ آباد کروں
کھول دے کاش مرے پاؤں کی زنجیر حریف

(نوائے ظفر، مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2008، ص:19،20)

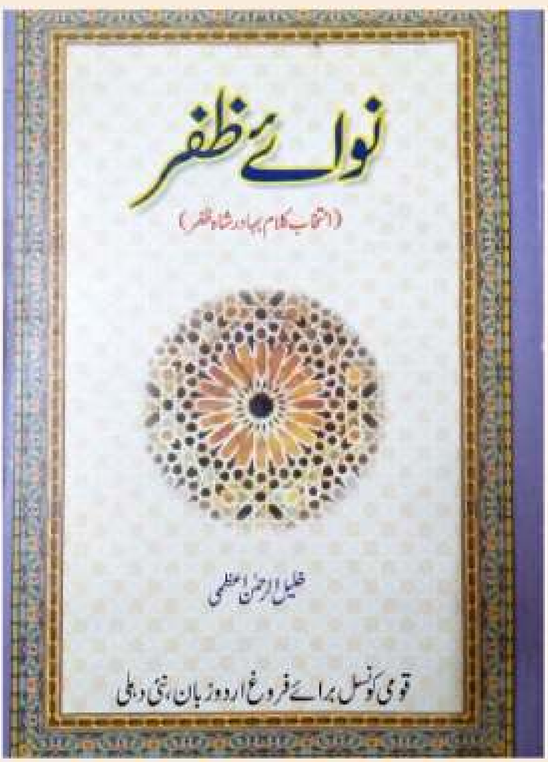

زنجیراورزنداں ظفر کی شاعری کی بنیادی علامتوں میں سے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زنجیر کی جھنکاران کے دردوکرب کا اظہار کررہی ہے۔ اس جھنکار میں اسیری کا بے پناہ غم بھی ہے اور رہائی کی غرض سے زنجیر کو توڑنے کی کوشش بھی۔ ظفر کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں ''اردو کے کسی غزل گو نے زنداں اور زنجیر کو اس تسلسل اور تواتر کے ساتھ بطور علامت استعمال نہیں کیا۔'' (نوائے ظفر، 19) اس کے ساتھ ہی قفس وآشیاں اور صیادوبلبل کے استعارے میں بھی ظفر کو اپنی بے بسی وبے چارگی کے مؤثر اظہار کے امکانات نظر آتے ہیں۔ اردو غزل کے یہ پامال استعارے ان کے یہاں بے پناہ تخلیقی وفور کے ساتھ زندہ علامت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے اشعار میں ظفر نے جہاں ایک طرف اپنی بے بسی وبے چارگی اور شکستہ پائی کا اظہار کیا ہے وہیں زوال پذیر حکومت اور تہذیب کے نام لیواؤں کی، اپنے ناموس کے تحفظ کے لیے آخری جدوجہد اور باغیانہ عزم کا مکمل اظہار بھی۔ کہنے کو تو ظفر نے اپنی زندگی کے آخری چند سال رنگون میں گزارے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پوری زندگی ذہنی جلاوطنی اور باطنی کرب کے عالم میں گزری تھی۔

اے کہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو
ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

(حسرت موہانی)

حسرت موہانی کے اس شعر میں موجود یہ بانگ دہل اعلان اردو شعرا کے سیاسی شعور کا پتہ دیتا ہے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سے وابستہ حسرت موہانی وہ پہلے طالب علم تھے جنھوں نے علی گڑھ کی پالیسی کے برخلاف انگریز دشمنی کا اعلان کیا اور 'اردوئے معلیٰ' میں سیاسی مضامین شائع کرنے لگے۔ اُس زمانے میں جب کہ مسلمان سیاست سے جھجکتے تھے علی گڑھ کا یہ بے باک نوجوان کانگریس میں شامل ہوگیا اور 1904 میں بمبئی کے کانگریس اجلاس میں ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے شریک ہوا اور سورت کے سیشن تک برابر شریک ہوتا رہا۔ سورت میں کانگریس کے اختلاف کے بعد یہ تلک کی رہبری میں کچھ عرصے تک کانگریس سے الگ رہے۔

1908 میں ایک بے نام قلم کار کا مضمون 'اردوئے معلیٰ' میں شائع ہوا جس میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر بے لاگ تنقید تھی۔ یہ مضمون سرکار کی نظروں میں قابل اعتراض ٹھہرا اور حسرت کو دو برس کی سزا ہوگئی۔ گرفتاری کے سلسلے میں مولانا پر جو مظالم ہوئے ان میں سے ایک بات جس کا ان کو ساری عمر قلق رہا یہ تھی کہ اردو کی بیش بہا کتابوں کا ذخیرہ جن میں بعض شعراء کے قلمی دواوین بھی تھے ان کی نگاہوں کے سامنے حکام نے جلا ڈالا۔ ایام اسیری میں جہاں شاعری نے چکی کی مشقت کو آسان کیا وہیں چکی کی مشقت نے شاعری کا رخ متعین کیا۔

سودیشی تحریک میں اس طرح حصہ لیا کہ سودیشی اسٹور کے نام سے سودیشی کپڑوں کی دکان قائم کی اور چاہا کہ ملک میں اس کی شاخیں جا بجا قائم کی جائیں۔ ان کی تجارتی سرگرمیوں کو دیکھ کر شبلی نے کہا تھا:

''تم آدمی ہو یا جن، پہلے شاعر تھے پھر پالیٹیشن بنے اور اب بنیے ہوگئے۔''

(بحوالہ، سید سلیمان ندوی، حسرت کی سیاسی زندگی، نگار حسرت نمبر، 1952، 112)

سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ حسرت ایک بار ان سے ملاقات کی غرض سے آئے۔ سید صاحب اس وقت ''الندوہ'' کے قریب گولہ گنج میں نواب مرشد آباد کے مکان میں رہتے تھے۔ اہل خانہ نے حسرت کے سونے کا انتظام کیا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ ان کے پائتانے رکھا جانے والا کمبل ولایتی تھا۔ حسرت نے رات سردی میں کاٹ دی لیکن کمبل نہیں اوڑھا کیوں کہ اس وقت سودیشی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا اور حسرت اس کے کٹر حامی تھے۔ یہی نہیں بلکہ پہلی بار مکمل آزادی کی تجویز پیش کرنے والے حسرت ہی ہیں۔ اس وقت جب کہ کانگریس ہوم رول، سیلف رول اور سوراج وغیرہ کے مبہم اصطلاحوں میں الجھی ہوئی تھی، 1921 میں حسرت نے کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں اس تجویز کو پیش کیا۔ سید سلیمان ندوی جو بنفس نفیس اس اجلاس میں شریک تھے لکھتے ہیں کہ ''آنکھوں نے دیکھا کہ ہزاروں کے مجمع میں ایک آواز بھی اس کی تائید میں نہیں اٹھی۔'' حسرت اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

اپنا سا ذوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم رہاں سے ہم
کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزل مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

نیرنگ تماشا دیکھیے کہ اسی مانگ کو پیش کرنے میں کانگریس کو مزید آٹھ سال لگے جب 1929 کے کانگریس سیشن میں دریائے راوی کے کنارے پنڈت نہرو نے یہی ریزولیشن پاس کیا اور کانگریس نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی اور خود مختاری کا پہلا اعلان اردو کے ایک دیوانے کی زبان سے ہی ہوا۔ یہی نہیں بلکہ مسلم لیگ کا ممبر بننے کے بعد وہاں بھی آزادی اور خود مختاری کا ریزولیشن پاس کیا۔

اردو کے ایک اور ہم شاعر محمد علی جوہر نے اپنی تحریر وتقریر سے

تحریک آزادی وطن میں ایک ایسی روح پھونکی کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں غلامی کی زنجیریں توڑنے کا عزم اور پختہ ہوگیا۔ محمد علی نے خلافت تحریک کا آغاز سلطنت عثمانیہ کی حمایت میں کیا تھا لیکن بعد میں اس کا رخ ہندوستان کی آزادی کی طرف مڑ گیا۔ وطن عزیز کی جدوجہد آزادی میں انھیں نظر بندی، جیل کی صعوبتوں اور دور دراز سفر کی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ 1919 میں محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی کی کانگریس میں شمولیت نے تحریک آزادی میں ایک نیا جوش بھر دیا۔ جواہر لال نہرو نے لکھا ہے ”علی برادران اس زمانے میں نظر بندی سے رہا ہو کر کانگریس کی شرکت کے لیے امرتسر پہنچے تھے۔ اب قومی تحریک نے ایک نئی صورت اختیار کرنا شروع کر دی تھی۔“

1920 کے کانگریس اجلاس میں ترک موالات کی تجویز کے پاس ہونے کے بعد گاندھی جی محمد علی اور شوکت علی کے ہمراہ ہندوستان کے دورے پر نکلے۔ باشندگان ہند پہلے ہی انگریزوں سے ناراض تھے ان کی آواز پر لبیک کہا، وکلا نے پریکٹس چھوڑ دی۔ ملازموں نے ملازمتوں سے ہاتھ کھینچ لیے اور نوجوانوں نے سرکاری تعلیم گاہوں کی تعلیم ترک کر دی۔ 1921 میں مولانا پر فوج میں بغاوت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلا اور دو برس کی قید ہوئی۔ یہ مقدمہ 'مقدمہ کراچی' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مولانا کا یہ شعر بہت مشہور ہوا:

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

تحریک خلافت نے ملک کی آزادی کے لیے مذہب کو بنیاد بنا کر علماء سے فتوئی لیا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد اور انگریز کی حکومت کے خلاف فتووں نے قومی تحریک کو مزید تقویت پہنچائی۔ محمد علی کے سامنے پوری تاریخ اسلام تھی اور واقعۂ کربلا کے پیش نظر امام حسین سے عقیدت۔ اس عقیدت کی بنیاد صرف مذہبی نہیں تھی بلکہ امام حسین کی شخصیت باطل کے مقابلے میں حق کی ایک علامت بھی ہے۔ کربلا اور متعلقات کربلا کو انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے وسیع تر معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جس کی مثال ان سے قبل کی اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ مولانا کے نزدیک واقعۂ کربلا حق و باطل کی وہ پیکار ہے جو تاریخ کے ایک مخصوص مرحلے پر رونما ہوئی اور حق باطل کی کشمکش تو ابد تک جاری رہے گی۔ اس لیے جب جب یہ مرحلہ آئے کہ حق کے لیے ظالم و جابر قوت سے ٹکرانا پڑے تو یہ ٹکراؤ واقعۂ کربلا کی توسیع ہے۔ ہندوستان میں انگریز کی استبدادی حکومت ان کے نزدیک یزیدی قوت کی ہی ایک شکل ہے۔ مولانا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پیغام جو ملا تھا حسین ابن علی کو
خوش ہوں وہی پیغام قضا میرے لیے ہے
جب تک کہ دل سے محو نہ ہو کربلا کی یاد
ہم سے نہ ہو سکے گی اطاعت یزید کی
ہے مقتل حسین کی اب تک یہی بہار
ہیں کس قدر شگفتہ یہ گل ہائے کربلا
اس باغ میں خزاں کا نہ ہوگا گزر کبھی
کیا رنگ دیکھیے ابھی دکھلائے کربلا
بنیاد جبر و قہر اشارے میں ہل گئی
ہوجائے کاش پھر وہی ایمائے کربلا

کسی موقع پر محمد علی جوہر کہتے ہیں:

”میں اول مسلمان ہوں، دوئم مسلمان ہوں اور آخر بھی مسلمان ہوں اور مسلمان کے سوا کچھ بھی نہیں“ تاہم ملک کا سوال آنے پر یہی محمد علی لب کشا ہوتے ہیں” میں اول ہندوستانی ہوں، دوئم ہندوستانی ہوں اور آخر بھی ہندوستانی ہوں۔ سوراج میرا مذہب ہے“

(ظہیر علی صدیقی، مولانا محمد علی اور جنگ آزادی، رام پور رضا لائبریری، 272)

اردو شعراء ہر عہد میں ہندوستانی عوام کے دلوں میں آزادی اور سرفروشی کی تمنا جگاتے رہے۔ اس شاعری کی تاریخی اہمیت ہے اور تاریخ صرف قصے اور واقعات کا بیان نہیں اس کے اندر ایک پورا عہد سانس لیتا ہے۔ اس تاریخ کو رقم کرنے میں اردو شعراء نہ صرف یہ کہ پیش پیش رہے بلکہ میدان جنگ میں دوسروں کے شانہ بشانہ رہے۔ رام پرساد بسمل اردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔ ان کی دوسری پہچان جس شعر سے ہے وہ دراصل بسمل عظیم آبادی کا ہے جو تخلص کی یکسانیت کی وجہ سے ان کے نام سے منسوب ہے لیکن نیشنل آرکائیوز کی ضبط شدہ نظموں کے اندراج نمبر 1636 میں 'وطن کا راگ' مرتبہ اکسیر سیالکوٹی کے حوالے سے ان کے نام سے درج ہے۔ جس کا مطلع ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

اس بحث سے قطع نظر کہ ان کا خالق کون ہے یہ اشعار اردو کے ہیں ان کی لطافت اور غزل کی مخصوص رمز و ایما نے اسے جنگ آزادی کا مقبول ترین نغمہ بنا دیا ہے۔ رام پرشاد بسمل ہندوستانی ریپبلکن ایسوسی ایشن کے رکن تھے۔ کاکوری ٹرین ڈکیتی کے جرم میں اشفاق اللہ خان کے ہمراہ جن

دیگر تین لوگوں کو پھانسی ہوئی تھی ان میں ایک رام پرشاد بسمل بھی تھے۔ان کی کئی نظمیں ضبط شدہ نظموں میں ملتی ہیں۔ان کی ایک نظم کانگریس پشپانجلی میں 1920 میں شائع ہوئی تھی جو ضبط کرلی گئی۔اس کے دو مصرعے:

الٰہی خیر وہ ہردم نئی بیداد کرتے ہیں
ہمیں تہمت لگاتے ہیں جو ہم فریاد کرتے ہیں
ستم ایسا نہیں دیکھا جفا ایسی نہیں دیکھی
وہ چپ رہنے کو کہتے ہیں جو ہم فریاد کرتے ہیں

(بحوالہ شارب ردولوی،"1857 کی جنگ آزادی کے غیر معروف شعراء"، جنگ آزادی کے اولین مجاہدین اور بہادر شاہ ظفر از ودیا ساگر آنند،317)

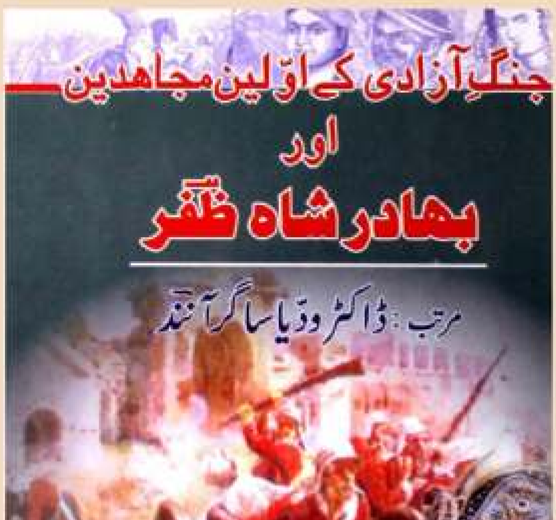


یہ اور اس قسم کی بہت سی نظمیں اس عہد کے نوجوانوں کے درمیان بہت مقبول تھیں۔جلسوں اور جلوسوں میں پڑھی جاتی تھیں۔عموماً کہا جاتا ہے کہ ہمارا سارا سیاسی ادب قابل احترام نہیں۔ان میں نعرے بازی ہوتی ہے۔سستی خطابت اور چیخ وپکار ملتی ہے۔اس حوالے سے شارب ردولوی کا ایک طویل اقتباس ملاحظہ ہو۔تحریک آزادی سے متعلق ان فن پاروں کی ادبی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ کلام ادبی اعتبار سے کیسا ہے یہ ایک علیٰحدہ سوال ہے۔کسی حد تک اس کا جواب ان اقتباسات ہی میں موجود ہے۔ان میں زبان و بیان پر گرفت بھی ہے ۔ رعایت لفظی، استعارے، کنایے اور تشبیہات کا استعمال بھی ہے پھر بھی انھیں ادبی پیمانوں پر رکھنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ان کی اپنی ایک جمالیات ہے اور اس جمالیات کے عناصر، اظہار مقصد اور جذبہ ہیں۔اور جہاں تک ان کا تعلق ہے اپنی جمالیات اور اظہار میں یہ شاعری ہر طرح کامیاب ہے۔ان نظموں اور گیتوں نے اپنے زمانے میں بے شمار لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ لاکھوں مردوں اور عورتوں کے لبوں پر یہ نغمے آزادی کا خواب بن کر مچلتے رہے۔انھیں پڑھ کر آج بھی جوش، ولولے اور قربانی کا احساس ہوتا ہے۔ان کی یہی اہمیت ہے۔اس کے ساتھ ان کی ایک اہمیت اور ہے کہ ان کے پیچھے ایک بہت بڑی تاریخ ہے۔ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی، انگریزوں کے مظالم اور ہندوستانی عوام کی مزاحمت کی، ان کے جذبے، ایثار اور قربانی کی۔(شارب ردولوی،" 1857 کی جنگ آزادی کے غیر معروف شعراء"، جنگ آزادی کے اولین مجاہدین اور بہادر شاہ ظفر از ودیا ساگر آنند، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 2007، 325)

اردو کے یہ چند شعرا جن کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے علاوہ نہ جانے کتنے معروف وغیر معروف شعرا ہیں جن کا ملک کی آزادی میں اہم کردار رہا ہے، جن کی نظموں، غزلوں اور گیتوں نے تحریک آزادی کے متوالوں کو نئی امنگ سے سرشار کیا اور جن کے لہو کی بوندوں نے آزادی کی شمع کو تیز تر کیا۔خلاصۂ کلام یہ کہ ہماری آزادی کی جدوجہد کا کوئی موڑ ایسا نہیں جہاں اردو نے اس کا ساتھ نہ دیا ہو۔ یہ آزاد ہندوستان، جس کی فضا میں ہم اور آپ سانسیں لے رہے ہیں اس کی آزادی میں اردو کی دل کش موسیقی کا ایسا کردار رہا ہے جس کے بغیر نہ صرف یہ کہ آزادی کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہوتی بلکہ ہر سال یوم آزادی کے جشن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

□□□

**Qamar Jahan Naseer**
Research Scholar (Ph.D.Urdu)
Jawaharlal Nehru University
New Delhi-110067

نثار حمن

# جنگ آزادی میں خواتین کا حصہ

عورت یوں تو صنف نازک کہی گئی ہے مگر اس کی عظمت سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے۔ میدان شجاعت ہو یا سیاست، کارزارِ حیات ہو یا پھر تعمیر کائنات، علم و ادب ہو یا سائنس و انجینئرنگ، فنون لطیفہ ہو یا حسن و جمالیات، ہر ایک میدان میں اس نے اپنی صلاحیت و لیاقت کے ثبوت پیش کیے ہیں اور حوصلہ و شجاعت کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ سماج کے بناؤ بگاڑ اور گھر کے سجانے سنوارنے میں تو اس کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے اسی لیے اس کو چراغ خانہ کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی وہ مرد سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہی ہے۔

عالمی اعتبار سے تو اس کی عزیمت کی کہانیاں زبان زد ہر خاص و عام ہیں۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں بھی اس کے کارنامے ہر ایک میدان میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ملک کی حکمرانی میں رضیہ سلطان، قاضی کی حیثیت سے شبنم آراء بیگم، کھیل کے میدان میں ثانیہ مرزا، سیاست میں اروناآصف علی، خلائی سفر میں کلپنا چاؤلہ، وزیر اعظم کی حیثیت سے اندرا گاندھی، صدر باوقار کے طور پر پرتبھا پاٹل، اولمپک رنر کی حیثیت سے پی ٹی اوشا، لوک سبھا اسپیکر کے طور پر میرا کمار کے نام لیے بغیر ہماری تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

ہندوستان کی جنگ آزادی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو بڑی طویل و صبر آزما جدو جہد نظر آتی ہے جس میں ہمارے بڑے اہم اور قیمتی بزرگوں نے اپنے عیش و آرام کو قربان کرتے ہوئے صعوبت و تکالیف کو سینے سے لگایا۔ زندگی کا آرام کھویا اور جدو جہد کو اپنایا۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو قربانیاں دیں انھیں کا نتیجہ ہے جو آج ہم آزادی کی نعمتوں سے مالا مال ہیں۔ خوشی کی بات تو یہ ہے کہ آزادی کی اس جدوجہد میں مردوں کے ساتھ ہی ہماری خواتین بھی پیش پیش رہیں اور انھوں نے بھی انگریزوں کے خلاف جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

یوں تو ان میں ہر قوم و ملت کی خواتین تھیں مگر موضوع کی رعایت سے ہم یہاں صرف مسلمان مجاہدین آزادی کے ذکر پر ہی اکتفا کریں گے۔

**آبادی بانو بیگم (بی اماں):**

ہندوستان کی تحریک آزادی یوں تو حریت پسندوں، جیالوں اور وطن پر مر مٹنے والوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ایسے ہی افراد میں ایک نام آبادی بانو بیگم کا بھی ہے جنھیں عموماً بی اماں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ آپ کی عظمت اور جذبۂ حریت کے تعلق سے صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ آپ وطن عزیز کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کرنے والے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی گوہر جیسے اولوالعزم مجاہدین کی والدہ تھیں۔ تاریخ کے صفحات اس کے شاہد ہیں کہ ان کی تربیت میں آپ کا زبردست کردار تھا جس کا ثبوت وہ شعر تھا جو اس وقت زبان زد ہر خاص و عام تھا۔

بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

یہ ایک طویل اور زبردست انقلابی نظم ہے۔ اس کے ذریعے ہی

تو بی اماں نے ان دونوں بھائیوں کے سینوں میں آزادی کی آگ بھڑکا دی تھی جس میں فرنگیوں کی حکومت جل کر خاکستر ہوئی۔ بذات خود بھی وہ ایک انقلابی لیڈر تھیں اور آزادی کا زبردست جوش ان کے اندر بھرا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر آپ کو ''ام الاحرار'' جیسے باوقار خطاب سے نوازا گیا۔

آپ 22-1920 کے شروعاتی غیر تعاون شدہ سیاسی انقلاب اور خلافت کے انقلاب میں شریک رہی تھیں۔ گاندھی جی بھی ان کا زبردست احترام کرتے تھے اور ان کے انقلابی کارناموں کو سراہتے تھے۔ بی اماں اگر ایک طرف مجاہدین کے کارناموں سے خوش تھیں تو دوسری طرف انھیں غداروں سے زبردست تکلیف پہنچتی تھی۔ وہ ان کے وطن دشمن رویے سے زبردست نالاں تھیں۔ اسی لیے انھوں نے لاہور کی ایک میٹنگ کے دوران کہا تھا:

> ''ہندوستانیوں نے پچھلے پچاس سال میں دو بڑی غلطیاں کی ہیں۔ ایک انگریزوں کو ہندوستان میں پیر جمانے دینا اور دوسرا انقلاب 1857 میں آدھے لوگوں کا وطن سے غداری کرتے ہوئے انگریزوں کا ساتھ دینا اور انقلاب کو ناکام بنا دینا۔''

انھوں نے ہر اس تحریک و عمل کا کھل کر ساتھ دیا جس سے انگریز کمزور اور انقلاب کو استحکام حاصل ہونا تھا۔ اس لیے انھوں نے کھادی کی نشر و اشاعت اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے زبردست کوششیں کیں جس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ دربھنگہ بہار میں انھوں نے خلافت تحریک کے لیے ساٹھ ہزار روپئے اکٹھا کیے تھے اور منگیر میں بیس ہزار روپئے۔ بہار کے بعد وہ اس کام کے لیے صوبہ سرحد جانا چاہتی تھیں لیکن انھیں سرحد پر ہی روک لیا گیا۔ مجبوراً انھیں وہاں سے اپنے علاقے میں واپس آنا پڑا۔

جنگ آزادی کی یہ بہادر خاتون بی اماں ہی تھیں جنھوں نے گاندھی جی کو نذرانے کے طور پر ''ٹوپی'' پیش کی تھی جو آج بھی تاریخ میں ''گاندھی کیپ'' کے نام سے مشہور ہے۔ انھوں نے ایک مرتبہ اپنے بیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا:

> ''اگر آزادی حاصل کرنے کی کوئی ایسی شرط قبول کروگے جو اسلام کی شان کے خلاف ہو اور ملک کے مفادات کے منافی ہو تو باوجود اپنی اس تمام محبت کے جو قدرتاً مجھے اپنے بیٹوں سے ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ صراط مستقیم سے ہٹ سکیں۔ میں انشاء اللہ اپنے ضعیف ہاتھوں سے ان کا گلا گھونٹ دوں گی۔''

ان الفاظ سے جہاں بی اماں کے جذبۂ دینی کی نشاندہی ہوتی ہے وہیں وطن سے محبت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ واقعی وہ ایک ایسی مجاہدۂ آزادی تھیں جو بیک وقت اسلام کی دلدادہ بھی تھیں اور محبِّ وطن بھی۔ اسی لیے ان کی تمام زندگی ان دونوں کی حفاظت و پاسداری میں تمام ہوئی اور زندگی بھر ان چیزوں کی فکر، کوشش اور جدوجہد میں لگی رہیں۔ ان کے نزدیک وطن کی آزادی زبردست عمل تھا جس کے لیے انھوں نے اپنے عیش و آرام کے ساتھ ہی اپنے دونوں بیٹوں کو بھی قربان کر دیا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ان کے کارناموں کو سنہرے الفاظ سے لکھا جائے گا اور ہر انصاف پسند انھیں سراہتا رہے گا۔ آزادی و انقلاب میں سرگرداں یہ عظیم مجاہدۂ آزادی آخر کار 13/نومبر 1942 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

### ارونا آصف علی:

آزادی ہند کی مجاہدات کے سلسلے میں ایک اور اہم نام ارونا آصف علی کا بھی ہے۔ یوں تو شروع سے ہی ان کے اندر آزادی کے جذبات اور حریت کا خمیر تھا لیکن انھیں شہرت نمک ستیہ گرہ کی اشتراکی تحریک میں شمولیت سے حاصل ہوئی۔ 1942 میں ''بھارت چھوڑو'' آندولن میں حصہ لینے کی وجہ سے 20/اکتوبر 1930 کو ایک سال کی سزا ہوئی۔ یہاں رہائی ملنے پر انھوں نے تحریکی ایکٹی وٹیز میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ 1942 میں جب ان کی گرفتاری کی نوبت آئی تو وہ انڈر گراؤنڈ ہو کر قومی لڑائی میں مصروف ہوگئیں۔ اس وقت ان کی گرفتاری پر

پانچ ہزار روپے کا انعام رکھا گیا تھا۔ لیکن وہ کسی طرح بھی گرفتار نہ ہو سکیں اسی وجہ سے انھیں 1942 کی ہیروئن کہا جاتا ہے۔ وہ زندگی بھر آزادی کی جنگ اور تعمیر وطن کے کاموں میں مصروف رہ کر بالآخر 29/ جولائی 1996 کو راہئ ملک عدم ہوئیں۔

## انصاری بیگم:

آپ کی پیدائش 5/ جولائی 1811 کو مظفر نگر اتر پردیش میں ہوئی تھی۔ آپ 1857 کے انقلابی جنگجویانہ تحریک کے سربراہ قاضی عبد الرحیم خاں کی ماں تھیں۔ اس کی سزا کی پاداش میں انھیں برطانوی فوج نے تھانہ کی عمارت میں زندہ جلادیا تھا۔

## بیگم زینت محل:

یہ آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی شریک حیات تھیں۔ 1857 کی جنگ آزادی میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس وقت ان کی فوجی صلاحیت اور جنگی قابلیت کھل کر سامنے آگئی تھی اور دنیا کو تسلیم کرنا پڑا تھا کہ وہ مغل سلطنت کی ملکہ ہونے کے ساتھ ہی تحریکی اور آزادی کے جذبات سے بھی سرشار تھیں۔ 3/ جولائی کو بیس ہزار فوجیوں کے ساتھ آپ کا انگریزوں پر یلغار کرنے کا منصوبہ تھا مگر ایک غدار کے انگریزوں سے مل جانے کی وجہ سے آپ کا یہ منصوبہ ناکام ہوگیا اور انگریزوں نے بادشاہ بہادر شاہ، بیگم زینت محل اور شہزادہ جواں بخش کو گرفتار کرلیا اور کچھ دن وہاں قید رکھنے کے بعد رنگون بھیج دیا جہاں وہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے راہئ ملک عدم ہوئے۔

## پادشاہ بیگم:

انگریزوں کے خلاف خواتین نے محاذ آرائی کی اور داد شجاعت لے کر اپنی بہادری کا سکہ دشمن کے دل پر بٹھا دیا تھا۔ پادشاہ بیگم کے زمانے تک اودھ کے نواب انگریزی رجمنٹ کی کٹھ پتلی بن چکے تھے۔ پادشاہ بیگم ہمت والی خاتون تھیں۔ وہ اپنی عملداری میں کسی طرح بھی انگریزی مداخلت برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔ اسی وجہ سے وہ انگریز کے کٹھ پتلی محمد علی شاہ کو بادشاہ تسلیم نہ کرتے ہوئے اس کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیے ہوئے تھیں مگر کچھ وجوہات کی بناء پر وہ شکست کھا گئیں۔ بالآخر انھیں گرفتار کرلیا گیا اور چنار کے قلعے میں نظر بند کردیا گیا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا اور اسی میں دفن ہیں۔

بلا شبہ اودھ میں پادشاہ بیگم پہلی خاتون ہیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف نفرت اور آزادی کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ علاقہ آج بھی ان کی عظمت کو سلام کرتا ہے۔

## طغلانی بیگم:

یہ دلی کے مغل شہزادے فیروز شاہ کی زوجہ تھیں۔ 1857 کی جنگ آزادی میں اپنے شوہر کے ساتھ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس میں ناکامی کے بعد ممبئی جا کر زیر زمیں ہوگئے اور پھر جنگلوں میں چھپ کر مسلسل تحریک آزادی کی سرگرمیوں میں مصروف رہیں۔ ایسی ہی مہم میں مصروف ایک مرتبہ سرونج کے جنگل میں چھاپہ مار جنگ کے دوران انگریزی فوج میں گھر جانے پر شہزادہ وہاں سے نکل کر دوبارہ مکہ معظمہ جا پہنچا بعد میں یہ بھی ان سے جا ملیں اور زندگی کے آخری ایام بڑی غریبی میں گذارے۔

## عزیزن بائی:

ہندوستان کی تحریک آزادی کے سلسلے میں عزیزن بائی کا ذکر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس جنگ میں ہمارے امراء و روٴسا اور سماج کے دیگر طبقات کے ساتھ ہی موسیقی کی محفلیں سجانے والی رقاصاؤں نے بھی حصہ لیا۔ یہ کانپور کی رہنے والی تھیں۔ جب انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند ہوا تو انھوں نے بھی

پاؤں سے گھنگھرو کھول کر ہاتھ میں تلوار اٹھالی اور انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں حصہ لیا اور خود میدان میں جا کر جنگ لڑی۔ انھوں نے عورتوں پر مشتمل ایک جنگی پلٹن بھی تیار کی تھی۔ جس میں عورتیں مردانہ لباس پہن کر ہاتھ میں تلوار لیے مرد مجاہدین کی مدد کرتیں اور ضرورت پڑنے پر خود بھی جہاد کرتیں۔ ایسے ہی ایک معرکے میں وہ گرفتار ہوگئیں۔ انگریز افسر جنرل ہولوک نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنی غلطی کی معافی مانگ لیں تو ان کا قصور معاف کرتے ہوئے ان کو رہا کر دیا جائے گا۔ عزیزن بائی کو یہ بات منظور نہ ہوئی۔ نتیجتاً عزیزن بائی کو بغاوت کا مجرم تسلیم کرتے ہوئے سزائے موت تجویز ہوئی اور گولی مار دینے کا حکم ہوا۔ اس طرح اس مجاہدۂ آزادی نے ہنستے ہوئے موت کو گلے لگا لیا اور مادر وطن پر خود کو قربان کرتے ہوئے مجاہدین آزادی میں اپنا نام رقم کرالیا۔

## ماتنگنی ہاجرہ:

ہاجرہ بنگال کے ضلع تاملک کی رہنے والی تھیں۔ 1942 کی تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پانچ ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ایک فوجی دستے کی قیادت ماتنگنی ہاجرہ کر رہی تھیں۔ مقابلہ بہت سخت تھا۔ وان یوکر کے پاس ماتنگنی ہاجرہ کے دستے پر لاٹھی چارج ہوا۔ انھوں نے ''کرو یا مرو'' کا نعرہ دیا۔ زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ اسی دوران انگریزی فوج نے گولی چلادی جس میں ان مجاہدۂ آزادی نے بھی جام شہادت نوش کیا۔ 1942 کی شہید خواتین میں اس مسلم مجاہدۂ آزادی کا نام بھی بڑے ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔

## نشاط النساء بیگم:

ہندوستان کی جنگ آزادی کے حوالے سے نشاط النساء بیگم وہ عظیم نام ہے جو ہمیشہ ہی ہماری تاریخ تحریک آزادی کے اوراق میں زریں حروف کے طور پر رقم کیا جاتا رہے گا۔ وہ پہلی مسلم خاتون تھیں جنھوں نے جنگ آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ انھوں نے اپنے شوہر کے پابند زنداں ہوجانے کے حادثے کو جس ہمت کے ساتھ برداشت کیا وہ ہماری انقلابی تاریخ کا روشن پہلو ہے۔ واقعی اس دوران آپ نے جس عزم وہمت اور حوصلہ وجرأت کا مظاہرہ کیا وہ میدان کارزار میں اتر کر تیغ وتیر چلانے سے کسی طرح بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔

انھوں نے عملی اعتبار سے بھی تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ وہ آزادی کی مہم میں شریک رہیں۔ 1901 میں ان کی حسرت موہانی کے ساتھ شادی ہوئی۔ 1908 میں حسرت گرفتار ہوئے اور پھر ان کی آزمائشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور یہ خاتون مجاہدہ بڑی جواں مردی کے

ساتھ ان کا مقابلہ کرتی رہی۔ حسرت موہانی قید میں رہے۔ یہ نہ صرف ان کا گھر سنبھالتیں تھیں بلکہ انھیں حوصلہ بھی دیتیں، ہمت بھی بندھاتیں تھیں۔ زیادہ محنت اور ذہنی پریشانی کی بناء پر آپ بیمار رہنے لگیں اور اسی بیماری کے عالم میں 18/اپریل 1937 کو گیارہ بجے دن میں بیگم حسرت موہانی اس دار فانی سے کوچ کرگئیں اور اپنی مجاہدانہ زندگی کے یادگار کارنامے جنگ آزادی کی تاریخ میں محفوظ کرا گئیں۔

معزز قارئین! ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلم مجاہدات آزادی کا یہ مختصر تذکرہ ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آج ہم آزادی کی جن حسین وخوشنما فضاؤں میں عیش وآرام کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں انھیں حاصل کرنے میں ہمارے اسلاف نے کس قدر قربانیاں دیں اور ان میں مسلمانوں کا کس قدر حصہ ہے۔ افسوس آج ہمارے یہاں کچھ لوگ آزادی کی لڑائی کو فرقوں اور مذہبوں میں تقسیم کر رہے ہیں جبکہ تاریخ شاہد ہے کہ اس میں ہر مذہب وقوم اور رنگ ونسل کے لوگوں کا حصہ ہے۔

❑❑❑

**Sana Rahman**
Miyan Sarai Katra Bazar
Sambhal-244302 (U.P)

ڈاکٹر زیبا ناز

# عورت کا بدلتا مقام

قدرت کی ہر تخلیق ایک عظیم منصوبہ کے تحت ظہور میں آئی، عورت اس کا شاہکار ہے۔ معاشرے میں عورت کو غیر معمولی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر دنیا کی آبادی، حسن، وقار، عزت، رعنائی، آرائش وزیبائش غرض کہ ہر صفت ناقص رہ جاتی ہے یہاں تک کہ مرد کے کارنامے بھی ادھورے رہ جاتے، لہٰذا اس کی اہمیت سے انکار بہت بڑی بھول ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

''وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ''

اس رنگ کو جب ہم پھیلتے، بڑھتے اور زندگی کی تصویر میں جھلملاتے دیکھتے ہیں تو اس کی معنویت ہم پر اور بھی گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ ملک وقوم کی تہذیب اور ارتقائی سفر کے ہر موڑ پر عورت کی کارفرمائیاں اہم رول ادا کرتی ہیں، ہر کامیابی اور کامیاب شخص کی پشت پر اس کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عورت اس طاقت کا نام ہے جو بحرِ حیات کا رخ پلٹ کر رکھ دیتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء سے ہی اس نے سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی، علمی اور مذہبی کاموں میں نمایاں کردار ادا کیا اور مرد کے دوش بدوش چل کر مصائب کا مقابلہ کیا۔

ہزاروں سال قبل قدیم مصری mythology میں عورت کو آسمان کی بلندی عطا کی گئی، ان کے یہاں آسمان عورت ہے، اور کائنات کی تمام حرکات کا محور اسی کی ذات ہے۔ قدیم مصری ''مصوری'' نامی کتاب میں لکھا ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عورت صرف گھریلو کام کرنے کے لیے ہے، جو صحیح نہیں ہے گھریلو کام انجام دینا تو اس کی دلچسپیوں اور کارکردگیوں کا نسبتاً ایک چھوٹا سا دائرہ ہے۔

عورت فطری طور پر آج بھی وہی ہے جو کل تھی۔ محبت واخوت، ایثار ورواداری، جذبات واحساسات، محنت ومشقت، خودسپردگی اور ماتحتی وغیرہ اوصاف حمیدہ اس کی طبیعت کا حصہ تھے اور ہیں اور سب سے بڑی خوبی اور طاقت قدرت نے اسے جنم دینے کی عطا کی ہے۔ دنیا کے ہر عظیم انسان کی پیدائش کا ذریعہ عورت ہی تو ہے، مرد اور عورت کے امتزاج سے ہی دنیا وجود میں آئی۔ لیکن ان تمام اوصاف وکمالات کے باوجود عورت کو ہمیشہ سے ہی جبر واستبداد کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ اگر ہم تاریخ کے اس دور پر نظر ڈالیں جب عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک برتا جاتا تھا اس پرآشوب دور کے بعد دیگر ممالک کا جائزہ لیں تو وہاں بھی عورت کا کوئی مقام نہیں تھا اور ہندوستانی عورت کی تو بہت ہی خراب حالت تھی اسے گھر کی چاردیواری میں قید کر کے روایت کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا تھا اس کے علاوہ اسے جنسی استحصال، بچپن میں شادی، ستی اور مونڈن جیسی کربناک اذیتوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ اس قسم کے اور بہت سے مظالم جنھیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور آنکھیں نم ناک ہوجاتی ہیں چنانچہ قدیم تاریخی زمانہ عورت کے حق میں قطعی سازگار نہیں تھا۔

ہندوستان کی تاریخ میں عورت کی جو حالت اوپر بیان کی گئی ہے اس کے علاوہ بھی عورت کو مشرقی ہونے کے ناطے شرم وحیا اور ذمہ داریوں کا لبادہ اوڑھا دیا گیا تھا۔ اپنی خستہ حالی اور پستی کی وجہ سے وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر رہ گئی تھی لیکن انقلاب ہر دور کا خاصہ رہا ہے ذہنِ انسانی ارتقاء پذیر ہے۔ جیسے جیسے دیگر امور میں تبدیلیاں رونما ہوئیں عورتوں کی حالت میں بھی سدھار کے پہلو ابھرے۔ روشن خیال دانشوران نے عورت کی خستہ حالی اور پسماندگی کو دور کرنے اور سماج میں اعلیٰ مقام دلانے کی طرف توجہ مبذول کی اس کے لیے عورت میں خود صلاحیت پیدا کرنے اور خفتہ بختوں کو جگانے کی ترغیب دی جانے لگی چنانچہ چند کشادہ ذہن خاندان کی لڑکیوں نے فلاحی میدانوں میں پیش قدمیاں کیں اور حصول علم کے واسطے گھر سے باہر نکلیں اور یہ اقدام ان کے حق میں مفید ثابت ہوئے۔ علم

سے ان کے حوصلے بیدار ہوئے ، ارادوں کو استحکام ملا اور آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے حقوق کو جانا اور مرد کے جابرانہ شکنجوں کو توڑنے کی طاقت اپنے اندر پیدا کی۔اب وہ سونے چاندی کے زیوارات کے بجائے علم کے خزانے کو ترجیح دینے لگی چنانچہ اس کی ذات اور صفات پر چھائے بدنصیبی کے بادل چھٹنے لگے۔

زیورِ علم سے آراستہ وپیراستہ ہوکر شعور کو بالیدگی ملی تو صنفِ نازک نے اپنے حالات وکیفیات کا بغور جائزہ لیا۔ زمانہ کی تنگ نظری اور ستم شعاری سے مقابلہ کے لیے وہ اپنی صلاحیتوں کو بیدار کرنے لگی، علاوہ ازیں اپنے حقوق کی حصولیابی اور آزادی کا مطالبہ کرنے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔ ایک طرف عورت کی ذاتی طور پر سرگرم کاوشیں ،تو دوسری جانب ہندوستانی ذہنوں پر مغربی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ لہٰذا یہ مہم کامیاب ہوئی اور اس نے بھی آزاد فضا میں سانس لینا شروع کیا۔

مہاتما گاندھی عورتوں کے حقوق کے زبردست حامی تھے ۔ 1931 میں انڈین نیشنل کانگریس نے نہرو جی کی قیادت میں عورتوں کے مساوی سیاسی اور قانونی حقوق کی بات کہی تھی عورتوں کے حق میں منصفانہ قانون بنائے گئے۔ سرکار نے دستور کے ذریعہ عورتوں کو برابری وآزادی کے حقوق دلانے کی ذمہ داری لی جس کے تحت بیوہ کی شادی، طلاق اور وظیفہ، آبائی وراثت میں حق، جہیز کی مخالفت، اسقاط حمل، مساوی روزگار اور میٹرنٹی ریلیف وغیرہ کی قانون سازی کی گئی یہی وہ پس منظر ہے جس نے عورتوں کے لیے فضا ہموار کی۔ انھیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور اپنی اہمیت کو ثابت کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔

عورت کے حق میں اتنی قانون سازیوں کے بعد امید ہوئی کہ اس کی ناگفتہ حالت میں واضح تبدیلی پیدا ہوگی اور یہ ملک کی ترقی اور فلاح کے کارنامے انجام دے کر نمایاں کردار ادا کرے گی لیکن ہماری تہذیب میں کوئی جدت پیدا نہ ہوسکی اور ترقی کا مناسب موقع اسے نہ مل سکا۔ عورت کی آزادی کے علمبردار لیڈران کیا واقعی اس کی عصمت کے محافظ ہیں؟...... آئے دن ہونے والے زنا بالجبر، درندگی، استحصال اور مظالم کو وہ روک سکتے ہیں؟......کیا جہیز کی وجہ سے جلائے جانے والی اور خودکشی کرنے والی عورتوں کے وہ ذمہ دار ہیں؟...... آج کی عورت اقتصادی اعتبار سے خودکفیل، تعلیم یافتہ اور آزاد ہے۔ لیکن مجھے یہ کہنے میں کوئی دریغ نہیں کہ وہ قطعی طور پر غیر محفوظ ہے خواہ وہ رضامندی سے ہو یا بالجبر وہ آج بہت جوکھم کا سامنا کررہی ہے جدیدیت کی آندھی نے اسے جھوٹی آزادی اور جنسی پائمالی کا وہ سبق سکھا دیا جس کا پورا پورا فائدہ مرد کو پہنچتا ہے۔ وہ پہلے بھی حالات کے آگے مجبور تھی اور آج بھی اس کے آگے مسائل کی آہنی دیواریں کھڑی ہیں۔ باپ بیٹے اور شوہر کے روایتی اور موروثی نظام کے شکنجے نے عورت کو پائمالی، ظلم وتشدد، نابرابری اور استحصال سے باندھ کر رکھا ہے۔ پردہ اٹھا کر دیکھا جائے تو نہ جانے کتنے آنسو، آہیں، درد وکرب اور رستے ہوئے ناسور ان مظلوموں کے نظر آئیں گے۔ ہمارے تہذیب یافتہ گھروں اور گاؤں میں زمین داروں اور مالکوں کے رعب ودبدبے، معاشرتی اصلاح کے نام پر اندرونی طور پر جمع خوری اور فلاحی کاموں میں مفاد پرستی اور سیاسی داؤں پیچ نے قانون کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور مردوں کے حق میں جانے والے قانون اور دوہری ذمہ داری نے عورت کو جہنم میں جھونک دیا۔ آج وہ جن حالات سے دوچار ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر مجموعی طور پر آج کی عورت گھر کی چار دیواری کو پھلانگ کر مرد کے ہمراہ قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہے بلکہ میں یہ کہوں گی کہ وہ سبقت حاصل کررہی ہے اور اپنی زندگی کو ایک نئے دھارے سے جوڑ چکی ہے۔ اس کی خود اعتمادی بحال ہوئی ہے سماجی اور اقتصادی طور پر اس نے طاقت حاصل کی ہے اگر چہ وہ صنف نازک نہ رہی پہلے کی عورت صرف گھریلو کاموں کی ذمہ داری نبھاتی تھی آج وہ دونوں میدانوں میں اپنی معنویت ثابت کررہی ہے۔ اسے مساویانہ حقوق بھی حاصل ہیں اگرچہ حقوق حاصل ہونے کے باوجود بھی اس پر مرد کے مقابلے کام کا بوجھ دوگنا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا ذہنی سکون واطمینان ختم ہو چکا ہے اور ذہنی الجھنیں اس کی ازدواجی زندگی پر بھی اثرانداز ہو رہی ہیں۔

گھریلو عورت کے مقابلے اس نے اگرچہ اپنی حالت کو سدھارا ہے اور سماج میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے لیکن آزادیٔ نسواں کے نام پر ملازمت کرنا اور گھر سے باہر نکلنا سماج سے متعلق بہت سے نقصانات کی نشاندہی بھی ہو رہی ہے، اس کی خانگی زندگی بھی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ ایک برسرِ روزگار عورت اپنے بچوں اور شوہر کے مطالبات اچھی طرح پورے نہیں کرپاتی جس کی وجہ سے زوجین کے مابین نااتفاقی اور بچوں کی پرورش میں خلل پڑتا ہے ان میں محرومی اور مایوسی درآتی ہے۔ بہرحال ان چند مسائل کے علاوہ مجموعی طور پر آج کی عورت ترقی کی راہوں پر گامزن ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں یہاں تک کہ ہوائی اور خلائی سفر بھی آج اس کی زد میں ہیں۔

**Dr. Zaiba Naaz**

Nai Basti, Bara Shaa Safa

Moradabad 244001(UP)

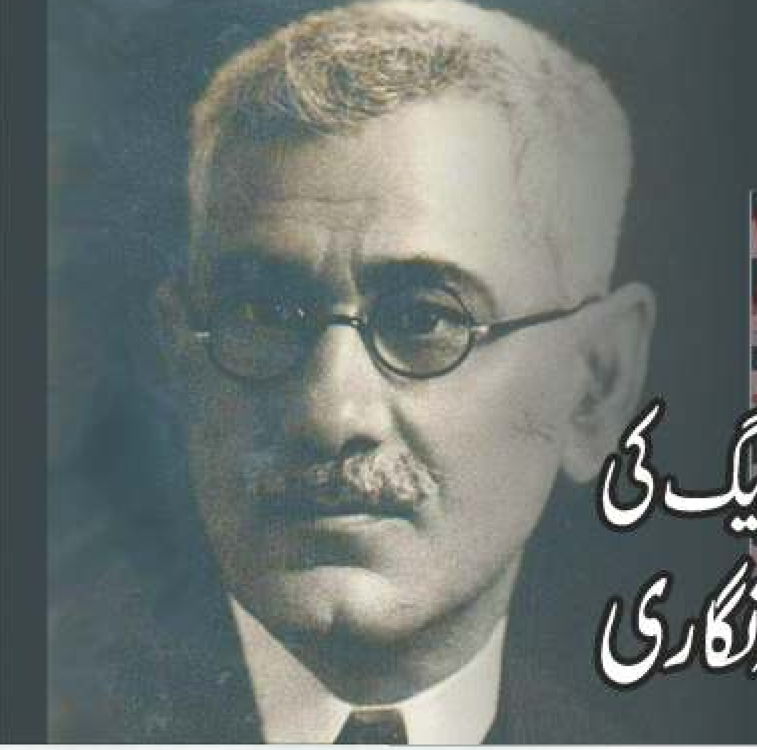

حسنِ جہاں

# مرزا فرحت اللہ بیگ کی انشائیہ نگاری

مرزا فرحت اللہ بیگ کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم صنف انشائیہ کا مفہوم اور اس کی خصوصیات کا مختصر جائزہ لیں۔

انشائیہ کا مفہوم واضح کرنے کے لیے اس کی تعریف کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، لیکن کسی بھی صنفِ ادب کی تعریف اس قدر جامع اور مکمل نہیں ہوسکتی کہ اس صنف کی ہر خصوصیت اس کے احاطے میں آجائے، کیوں کہ ہر صنف میں بڑی رنگارنگی و تنوع ہوتا ہے۔ انشائیہ کی تعریف انسائیکلو پیڈیا یا بریٹانیکا میں یوں کی گئی ہے:

> ”اوسط لمبائی کا نثری مضمون، جس میں سہل اور سرسری انداز میں صرف اس موضوع سے بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔“

مشہور انگریزی ادیب جانسن نے انشائیہ کی اہم خصوصیت بڑے ہی مختصر انداز میں بیان کی ہے۔ وہ انشائیہ کو Loose sally of mind یعنی ذہن کی آزاد ترنگ کہتے ہیں۔ لفظ ترنگ انشائیہ کی روح کو ظاہر کرتا ہے کیوں کہ انسان ترنگ میں آکر ہر موضوع پر بے تکلف انداز میں باتیں کرسکتا ہے۔ یعنی انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ انشائیہ کا سب سے بڑا وصف اس کا اسلوب ہے۔ اسلوب کے بغیر فن میں جاذبیت، دل کشی اور تاثیر کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اسلوب میں شخصیت کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے اس لیے اسلوب ہی کو انسان کی شخصیت کا آئینہ دار قرار دیا گیا ہے۔ انشائیہ میں مصنف طنز و مزاح کا پہلو بھی اختیار کرسکتا ہے۔ انشائیہ کی ایک خصوصیت اس کا بے ربط ہونا بھی ہے، چوں کہ انشائیہ نگار، انشائیہ کے لیے کوئی مربوط منظم پلاٹ یا اسکیم وضع نہیں کرتا، اس لیے بے ترتیبی لازمی ہے اور یہ بے ترتیبی ہی انشائیہ کا حسن اور اس کی خوبی ہے۔ انشائیہ نگار کا بھٹکنا اور منتشر الخیالی محض کیف و نشاط سے متعلق ہے۔ شاید اسی لیے اس کو ادبِ لطیف کا نام دیا گیا ہے۔

اب ہم مرزا فرحت اللہ بیگ کی انشائیہ نگاری کا جائزہ لیں گے۔ اردو ادب میں فرحت اللہ بیگ ایک مزاح نگار ادیب کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے انشائیوں میں بھی مزاح کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے، کیوں کہ انشائیہ میں مزاح کا عنصر بھی ضروری ہے۔ اس لیے ایک انشاپرداز انشائیہ میں ظرافت کے ترکش کا ہر تیر استعمال کرسکتا ہے مگر اس کے لیے سلیقہ شرط ہے۔ بہ قول اختر اورینوی:

> ”اس میں مزاح لطیف سے لے کر طنز تک کی گنجائش ہے۔ ہنسی مذاق، بولی ٹھولی، پھبتی، سوانگ، گدگدی، چٹکی اور ظرافت کی دوسری قسموں کا بھی برمحل استعمال انشائیوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ جملے بازی اور فقرے کسنا یا وقت کی سمجھ یا کوئی پتے کی بات کہہ دینا یا کوئی چبھتا ہوا ریمارک یا ہلکی سی چوٹ یہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ ظرافت کا استعمال ہر جگہ خوش مذاقی چاہتا ہے۔ انشائیوں میں ظرافت کی چاشنی ایسی ہو کہ بس چاشنی ہی رہے، کبیدگی اور بے زاری پیدا نہ کرے۔ دراصل انشائیوں میں سب سے زیادہ مزاح لطیف ہی بجتا ہے۔“

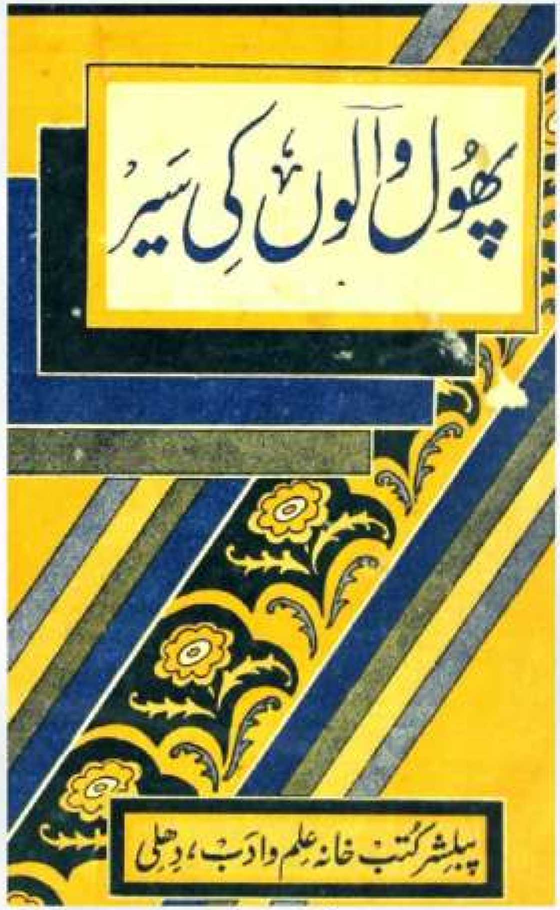


مرزا فرحت اللہ بیگ کی انشائیہ نگاری کا سب سے اہم وصف بھی شگفتہ مزاجی، زندہ دلی اور ظرافت ہے جس کا اندازہ ہمیں ان کی تحریروں سے جا بہ جا ہوتا ہے۔ تجہیز و تکفین میں شرکت کا ہم سبھی کو کبھی نہ کبھی سابقہ پڑتا ہے۔ غم کے موقع پر جو کچھ ہوتا ہے اس سے سبھی لوگ واقف ہیں۔ کسی کے انتقال کی خبر سن کر اس کے گھر پہنچنا، اس کے ورثا سے اظہار تعزیت کرنا، میت کے غسل و کفن کی تیاری، جنازے کا جلوس، قبرستان کا نظارہ اور میت کو قبر میں اُتارنے کا عمل غرض یہ سبھی باتیں ہمارے مشاہدے کی ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے انشائیہ ''مردہ بدست زندہ'' میں اس تجربہ کو بیان کیا ہے، لیکن یہ بیان اس خوب صورتی کے ساتھ ہوا ہے کہ اس کے سارے مضحک پہلو نمایاں ہوگئے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ہمارے عمل میں جو تضادات ملتے ہیں ان کو اس طرح نمایاں کیا گیا ہے کہ ہمیں اپنا چہرہ اس آئینہ میں صاف نظر آجاتا ہے اور ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ ایسے موقع پر بھی ہمارے حرکات و سکنات میں خلوص کم اور رسمی دکھاوا زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے لیے فرحت اللہ بیگ کے اس انشائیہ ''مردہ بدست زندہ'' کے کچھ اقتباسات دیکھیے:

''یہ لیجیے سامنے ہی مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہیں۔ موٹریں بھی ہیں، گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں، امیر بھی ہیں۔ بے چارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازے پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا اندر چلا جاتا ہے۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں میں ہی مل کر کھڑا ہوجاتا ہے۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے کیا مرگئے؟ بھئی ہمارے تو بڑے اچھے دوست تھے۔ اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس یا پانوں کی ڈبیا نکالی۔ لیجیے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار ہوچکا۔''

''اب راستے والوں کی سنیے اگر میت کے ساتھ دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا۔ اگر جنازے کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوئے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آرہے ہیں۔ آئے مرنے والے کا نام پوچھا، مرض دریافت کیا اور واپس ہوگئے۔ گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کو تفویض کردیا ہے۔''

مرزا نے قبرستان کی حالت یوں بیان کی ہے:

''میاں ستے رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں۔ ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور اُدھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے۔ رات بھر یہ پھول بستر پر رہے۔ صبح باسی پھول لے جا کر قبر پر چڑھا دیے۔ خیر کیا حرج ہے؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا۔ مردے بھی خوش ہوگئے۔''

انشائیہ کو ہلکے پھلکے ادب سے منسوب کیا جاتا ہے اس لیے انشائیہ نگار بنیادی طور پر ایسی فضا کا انتخاب کرتا ہے جو پڑھنے والے کو مسرت بہم پہنچا سکے۔ اس موقع پر انشائیہ نگار کی انسان دوستی، بے تکلفی اور بے باکی اس کے کام آتی ہے۔ اسی سے وہ اپنی بات میں اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ وہ صرف کسی حقیقت کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ کسی وسیع موضوع کے کسی گوشے پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کی تحریروں میں تشریح، وضاحت اور تفصیل نہیں ملتی، وہ صرف چند مسائل کی طرف ذہن کو خوب

صورت انداز میں منتقل کر کے چھوڑ دیتا ہے۔ اس پر سیر حاصل بحث کرنا اس کے فرائض میں شامل نہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے انشائیہ ''نئی دلّی'' کا یہ اقتباس دیکھیے جس میں دلّی کے بڑے میاں ''مرزا قمرو عرف مرزا چھکڑا'' دلّی کی بدلی ہوئی معاشرت پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''اب لباس کیا ہے، بس یہ سمجھ لو کہ کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا، سلیقے کا حال یہ ہے کہ بچوں کی مالک آیا، باورچی خانے کی مالک ماما، سینے پرونے کے ذمے دار درزی، درزی نہیں ماسٹر ٹیلر، اب ان کو گھر والیاں کون کہے گا۔ شام ہوئی اور بیگم صاحبہ ہوا خوری کو نکلیں۔ صاحب ایک طرف گئے، میم صاحب دوسری طرف گئیں۔ اب نہ اِن کو اُن کی خبر اور نہ اُن کو اِن کی خبر۔''

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے انشائیہ ''پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر'' میں بتایا ہے کہ مٹتی ہوئی جاگیردارانہ تہذیب کیا تھی اور نئی نسل کو اس سے مفاہمت کرنے میں کیا دشواری آ رہی تھی۔ اس انشائیہ میں ایک نواب صاحب کا تذکرہ ہے، وہ اپنے صاحب زادے کو علی گڑھ کالج میں بہ طور طالب علم بھیجنا چاہتے تھے اور ان کو اپنے صاحب زادے کے لیے ایک اتالیق کی ضرورت تھی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے ایک عزیز کی سفارش پر اتالیقی کے لیے نواب صاحب سے ملنے جاتے ہیں۔ نواب صاحب کے دیوان خانے میں جا کر مرزا کو جو نقشہ نظر آتا ہے اور قدیم تہذیب کے دل دادوں سے ان کا سامنا ہوتا ہے وہ ان کے لیے کافی پریشان کن تھا۔ انشائیہ کا یہ اقتباس دیکھیے:

''ہماری اصطلاح میں ''سلام کرنا محض ماتھے کے سامنے ہاتھ لے جانے کو کہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ بڑے آدمی ہیں ذرا جھک کر اس فرض کو ادا کر دوں۔ جھکا، سلام کیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن ادھر اُدھر جو دیکھتا ہوں تو سب لوگ جھکے ہوئے زنازن ہاتھ چلا رہے ہیں۔ نقل را چہ عقل، میں نے بھی غپ رکوع میں جا پٹا کے ہاتھ چلانے شروع کر دیے۔ مگر کن انکھیوں سے دوسروں کو دیکھتا رہا۔ جب دیکھا کہ اب سب سیدھے کھڑے ہو گئے تو میں نے بھی سیدھے کھڑے ہو کر نیت کی طرح ہاتھ باندھ لیے۔ مگر حضرت آپ ہنستے کیوں ہیں، کیا عید کی نماز میں اپنی حالت بھول گئے؟ آپ ہر سال نماز پڑھتے ہوں گے۔ مگر ہر مرتبہ تکبیر کے وقت خدا کے فضل

سے ادھر اُدھر دیکھنا ہی پڑتا ہوگا کہ دوسروں کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں یا بندھے ہوئے۔ دوسرے رکوع میں جا رہے ہیں یا ابھی اور تکبیر باقی ہے۔ میں نے پہلے ہی عرض کر دیا تھا کہ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر ہمیشہ ایسی ہی الجھنیں پیدا کرتی ہیں، پھر آپ کا میرے حال پر مسکرانا یقیناً بے جا ہے۔''

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے زور قلم سے معمولی موضوعات میں بھی زندگی پیدا کر دیتے ہیں جن میں اخلاقی اور اصلاحی نکتے پوشیدہ نظر آتے ہیں۔ ان کے انشائیہ ''اونھ'' میں لفظ ''اونھ'' پر ان کے زور قلم کا کمال دیکھیے:

''طالب علموں کو دیکھو تو اونھ کا زور سب سے زیادہ انھیں میں پاؤ گے۔ سال بھر کھیل کود میں گزار دیا، امتحان کا خیال آیا تو اونھ کر دی یعنی کل سے پڑھیں گے۔ آخر یہ اونھ یہاں تک پہنچی کہ امتحان آ گیا فیل ہوئے، اس فیل پر بھی اونھ کر دی۔

یہ اونھ بڑی بے معنی ہوتی ہے اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ

باپ زندہ ہے کھانے پینے اور اڑانے کو مفت ملتا ہے اگر وہ مر بھی گئے تو جائیداد موجود ہے۔ قرضہ دینے کو ساہو کار تیار ہیں پھر پڑھ لکھ کر کیوں اپنا وقت ضائع کریں۔''

مرزا فرحت اللہ بیگ کے انشائیوں کو اگر ہم تنقیدی نظریے سے دیکھیں تو وزیر آغا کا یہ قول بالکل درست ہے:

''فرحت اللہ بیگ کے یہاں وہ بہت سی باتیں ملتی ہیں جو انشائیہ کا امتیازی وصف قرار پا چکی ہیں۔ مثلاً شگفتہ انداز نگارش اور موضوع سے مصنف کا گہرا تعلق۔''

فرحت اللہ بیگ کے انشائیوں میں مزاح کی ہلکی ہلکی موجیں اٹھتی ہیں۔ مردہ بدست زندہ، ایک وصیت کی تعمیل، دامِ خیال، میری بیوی، کل کا گھوڑا، مہینے کی پہلی تاریخ، اونھ، عشق کی گولیاں اور پٹنا فرحت اللہ بیگ کے بہترین مزاحیہ انشائیے ہیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ نے مزاح کے پردے میں سماجی نظام کی خامیوں اور تہذیبی مظاہر کی بے اعتدالیوں اور اخلاقی بدعنوانیوں کی اصلاح کی طرف ہماری توجہ مبذول کی ہے۔ غلام، کم سنی کی شادی، یار باش، فرماں بردار بیٹا اور میری بیوی اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان انشائیوں میں ہماری معاشرتی زندگی کے طنزیہ خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں مقصدیت اور افادیت کے چہرے پر طنز و مزاح کا نقاب ڈال دیا گیا ہے۔

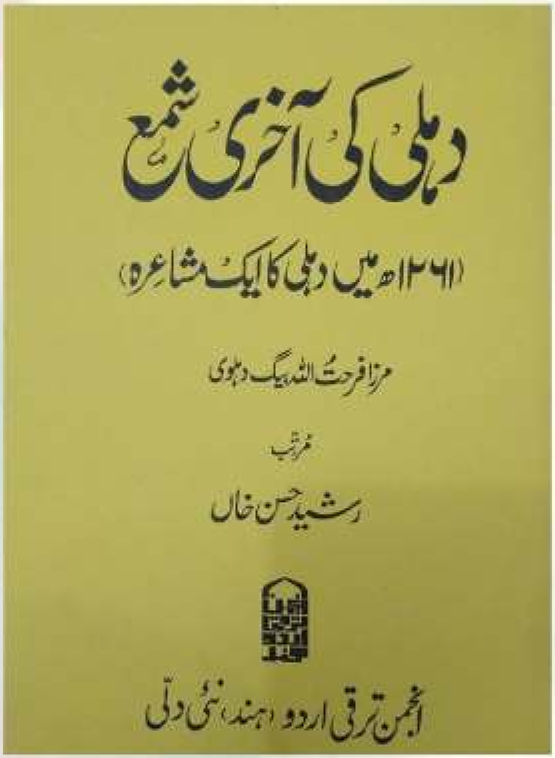


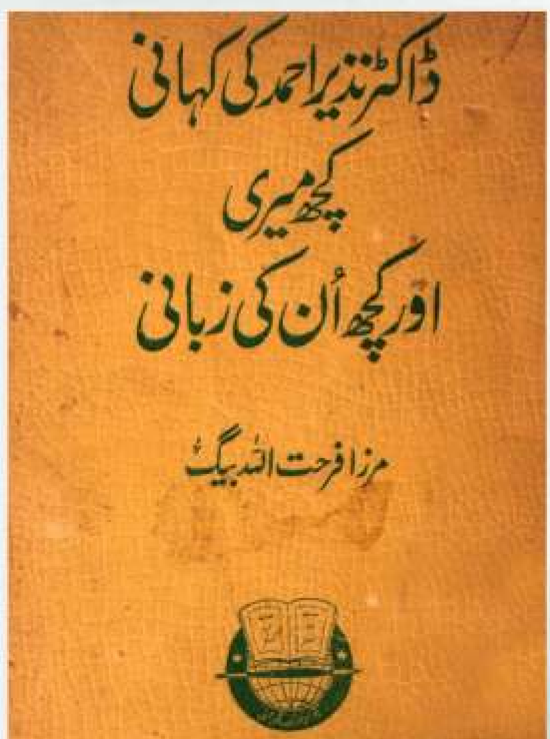


مرزا فرحت اللہ بیگ کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کا انداز بیان بے حد دل نشیں اور مؤثر ہے۔ زبان و بیان نہایت رواں اور دل کش ہے۔ دلّی کے روزمرہ کی سادگی اور انداز گفتار کی بے تکلفی، شوخی، گھلاوٹ اور محاوروں کی چاشنی نے ان کے انشائیوں کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرزا کے انشائیے محض ضیافتِ طبع ہی نہیں بلکہ ان میں ایک دعوتِ فکر بھی پوشیدہ ہے۔

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے درست فرمایا ہے:

''یہ ادب کی پھلجھڑی ہی نہیں، بلکہ ادب کے فکر و نظر کے آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے ہیں۔''

**Husne Jahan**
C/O-Humayun Sheikh
Qazi Masood House
Opp- Khetan Super Market
Birla Mandir Road
Patna-800004 (Bihar)

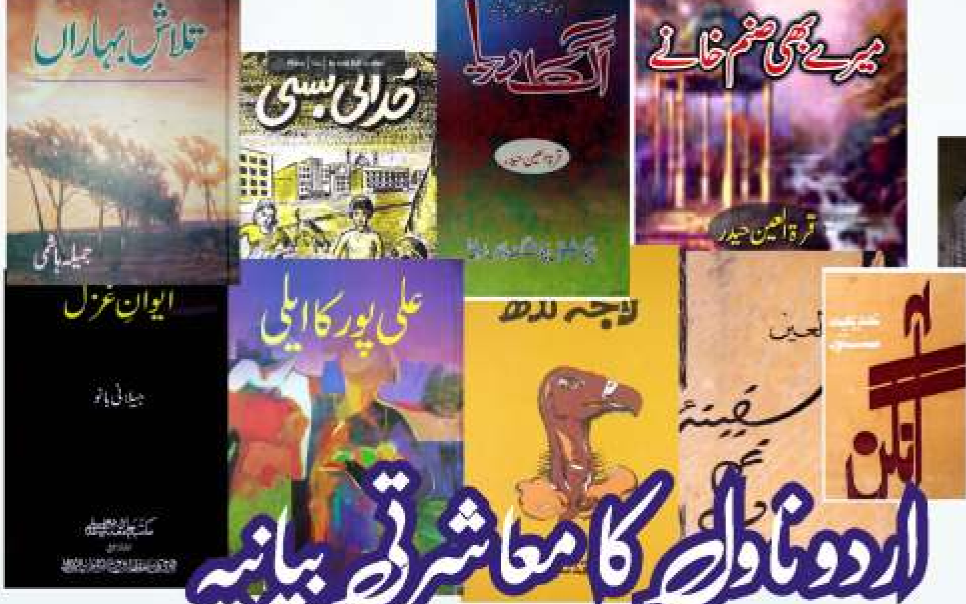


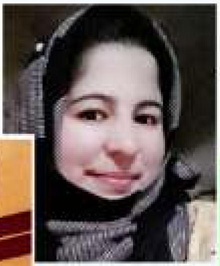

شاہینہ یوسف

# اردو ناول کا معاشرتی بیانیہ

ادب اور زندگی کا رشتہ نہایت سنگین ہوتا ہے۔ جہاں ادب زندگی کا آئینہ اور عکاس ہوتا ہے وہیں ادب زندگی کی قدم قدم پر رہنمائی بھی کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ادب زندگی کی تنقید کرنے کے علاوہ اسے بہترین عادتیں اپنانے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ تبدیلی جو کہ قدرت کا قانون ہے اور نہ صرف جاندار اشیاء تبدیلی سے ہمکنار ہوتی رہتی ہیں بلکہ بے جان اشیا بھی خود کو اس سے نہیں بچا سکتی۔ اسی اثناء میں اگر ہم دیکھیں تو انسان کے نظریات، خیالات، احساسات وغیرہ میں بھی تبدیلی ایک لازمی جز ہے۔ اگر انسانی تہذیب میں تبدیلی کی بات کی جائے تو اس کی شروعات یورپ سے ہو کر پوری دنیا کو اپنے دامان صف میں لپیٹتی گئی اسی طرح ادب کی بیشتر اصناف میں ان اثرات کی خصوصیات جلوہ گر ہوئیں ان اصناف میں ناول کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جو انسانی زندگی کی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اچھے عادات اپنانے کی تلقین میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے۔ ناول کے بنیادی فریضے کی بات کی جائے تو اس کا اصلی فریضہ اپنے زمانے کے سماجی حالات اور مسائل کی پیشکش ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا اور پریم چند کے بعد ترقی پسندی کے زیر اثر سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ کا نام اردو ناول میں حقیقت نگاری میں نئے تجربے کرنے والوں اور ناول کو نئی جہات سے روشناس کرانے والوں میں سر فہرست ہے۔ اسی طرح اگر ہم تقسیم ہند کی بات کریں تو اس دور میں لوگوں کی سیاسی و سماجی زندگی میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اس دور میں جو ناول لکھے گئے ان میں بیشتر ناولوں کے موضوعات فسادات سے متعلق تھے۔ فسادات اور ہجرت کے علاوہ اردو ناول میں جس واقعے کو موضوع بنایا گیا وہ ہندوستان میں جاگیرداری اور زمینداری کا خاتمہ تھا۔ اسی اثناء میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، جیلانی بانو، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور وغیرہ نے تبدیل شدہ حالات کو موضوع بنایا۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تحریکِ آزادی کی لگاتار جدوجہد کے بعد ہندوستان بظاہر آزاد تو ہو گیا لیکن ساتھ ہی ساتھ نہ بھرنے والے زخم دے گیا جو کہ بعد میں ناسور کی شکل اختیار کر گئے اس سلسلے میں ملک کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اور ادیب سماج کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ مجبوری، بھوک، افلاس جیسی مصیبتوں نے ادبا کے اذہان کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا اور انھوں نے ان موضوعات کو اپنے ناولوں میں پیش کر دیا یا یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان ادباء نے اپنے قلب کے بوجھ کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں جو ناول معرض وجود میں آئے ان میں راما نند ساگر کا ''اور انسان مر گیا''، قدرت اللہ شہاب کا ''یا خدا''، نسیم حجازی کا ''خاک اور خون''، وغیرہ جیسے ناول اس دور کا آئینہ پیش کرتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر جو کہ اپنا منفرد اسلوب رکھتی ہیں انھوں نے ناول ''میرے بھی صنم خانے'' (1949) میں لکھ کر اردو ادب میں ایسی چھاپ چھوڑی جو شاید ہی دھندلی پڑ سکے اس ناول کا موضوع بھی تقسیم ہند ہے۔ اس کے چند ہی برس بعد ان کا دوسرا ناول ''سفینۂ غم دل'' (1953) منظر عام پر آیا۔ اس ناول کا موضوع بھی اگرچہ وہی ہے لیکن انداز بیان کے باعث یہ ناول منفرد خیال کیا جاتا ہے اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ قرۃ العین حیدر کو اپنی قدروں سے جو لگاؤ تھا اسی عشق نے ان سے یہ ناول لکھوائے۔ اس کے بعد (1959) میں ناول ''آگ کا دریا'' لکھ کر قرۃ العین حیدر ہندوستانی شعور کی تاریخ کو منظر عام پر لائیں۔ ''آگ کا

دریا'' ہندوستان کی تہذیبی و تمدنی تاریخ کو گوتم نیلمبر کے ذریعے پیش کرتا ہے۔ اس ناول میں زندگی کی گوناگوں وسعتیں موجود ہیں۔ ناول میں مصنفہ کا بھرپور شعور دکھائی دیتا ہے۔

تقسیم کے بعد منظر عام پر آنے والے ناولوں میں شوکت صدیقی کے ناول ''خدا کی بستی'' (1960) کو بھی منفرد مقام حاصل ہے۔ اس ناول میں شوکت صدیقی نے پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اس ملک کے معاشرتی مسائل کو بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے پاکستانی جمہوری نظام کی مصوری جس طرح کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شوکت صدیقی ایک دلیرانہ ادیب کی طرح معاشرے میں پھیلی خرابیوں کو پیش کرنے میں بالکل بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے اور اگر ان کے اس ناول کو حقیقت نگاری کی جاندار مثال سے تعبیر کیا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

ممتاز مفتی کا ناول ''علی پور کا ایلی'' (1961) ''خدا کی بستی'' کے بعد پاکستان میں لکھا جانے والا شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول ایک متوسط گھرانے کا نقشہ پیش کر کے قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ اس ناول میں ممتاز مفتی نے سماجی بے راہ روی پر طنز کر کے ایسے ماحول کی عکاسی کی ہے جہاں والدین اپنے بچوں کی پرورش پر ذرا بھی دھیان نہیں دیتے۔

آزادی کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں جس ناول کو اہمیت حاصل ہے وہ جمیلہ ہاشمی کا ''تلاش بہاراں'' (1961) ہے۔ یہ ناول اپنا منفرد اسلوب رکھتا ہے۔ ''تلاش بہاراں'' کی زبان سلیس، سادہ اور رواں ہے۔ اس ناول میں ہندوستانی معاشرے میں بڑے لوگوں کی خود غرضی جیسی باتوں پر طنز کیا گیا ہے۔

خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' (1962) میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں یو پی کے ایک متوسط گھرانے کے تحریک آزادی کے پس منظر میں پیدا ہونے والی معاشی و جذباتی مسائل کو حسین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار بڑے چچا ہیں جو انگریزوں کی استحصال پسندی کو نفرت کی نظروں سے دیکھتا ہے، یہ آزادی میں برابر شریک ہوتا ہے، وہ گاندھی و نہرو کے پیرو اور کٹر نیشنلسٹ ہو کر ہندو مسلم فسادات کی آندھی چلنے سے لاچار اور بے بس محسوس ہوتے ہیں:

> ''بڑے چچا اس صدمے سے جیسے نڈھال ہو گئے تھے بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہے، یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیا ہو گیا۔ یہ ہندو مسلم ایک دم سے ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ انھیں کس نے سکھایا؟ ان کے دل سے محبت کس نے چھین لی؟ وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کر دیتا۔ ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ پر اب کیا رہ گیا۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آ گیا''۔

(آنگن، خدیجہ مستور، علی گڈھ، 1983، ص304)

اسی طرح اگر حیات اللہ انصاری کے ناول ''لہو کے پھول'' (1970) کی بات کی جائے تو یہ بھی اردو ادب کے بہترین ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ناول پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اور یہ ناول تحریک آزادی سے لے کر حصول آزادی کے بعد پہلے پنج سالہ منصوبے تک کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تعلیمی مسائل پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ زندگی کی ایک سچی تصویر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔

جیلانی بانو کا ''ایوان غزل'' (1970) بھی اردو ناول کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول میں حیدر آباد کے جاگیرداری نظام کے استحصال پسندانہ رخ کو موضوع بنا کر پیش کیا گیا ہے:

> ''واحد حسین دکن کے پرانے جاگیردار ہیں اور ایوان غزل کے بانی ہیں۔ اس قدر جمال پرست واقع ہوئے ہیں کہ ہر وقت شاعری اور پھولوں کے حسن میں ڈوبے رہتے ہیں لیکن ان کا بیٹا راشد ایک تاجر ہے جو ہندوستان پولیس کے ایکشن سے پہلے پٹرول، ادویات اور سیمنٹ کی ذخیرہ اندوزی کر کے نئے دولتمند طبقے میں شامل ہو جاتا ہے۔ اپنی تجارت کے فروغ کے لیے وہ چاند اور غزل کو استعمال کرتا''۔

(برصغیر میں اردو ناول، ڈاکٹر خالد اشرف، دہلی، 2003، ص63)

''بستی'' انتظار حسین کا لکھا ہوا ناول ہے جو (1980) میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں انتظار حسین نے علامتی انداز اپنایا ہے۔ مذکورہ ناول میں انتظار حسین نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نوجوانوں، فنکاروں، فلمکاروں وغیرہ کی تصویر کشی کر کے اردو ناول نگاری کی تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ بقول سراج منیر:

> ''بستی کسی ادبی ٹوٹکہ بازی کی نہج پر لکھی گئی کوئی تحریر نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک گہری نفسیاتی اور ضرورت اور اس کے مقابل انتاہی ہمہ گیر تجربہ بھی موجود ہے''۔

(جدید اردو ناول تنقید اور تجزیہ، ڈاکٹر طارق چھتاری، کشمیر، 2011، ص62)

اگر ہم دیگر ناولوں کی بات کریں تو اس سلسلے میں احسن فاروقی کا

ناول ''شام اودھ''، عبدالصمد کا ''دو گز زمین'' جیسے ناول بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ان ناولوں کے ذریعے بھی سماجی، سیاسی، تہذیبی روایات وغیرہ کی حسین اور سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔

تقسیم اور ہجرت کے موضوع کے علاوہ شہری زندگی کے ان تضادات کو بھی ناولوں اور افسانوں کا موضوع بنایا گیا جو تقسیم کے بعد شروع ہوئے۔اس ضمن میں کرشن چندر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے کئی ناول لکھ کر اردو ناول نگاری کے باب میں اضافہ کیا۔ان کے ناول میں ''باون پتے لوفرایک ہیروین'' (1966) میں بمبئی کے فٹ پاتھ پر بسنے والے جیب کتروں، مزدوروں کے بالکل مقابل سماج میں معزز کہلانے والے بڑے لوگوں کی زندگی کے تاریک پہلوؤں سے پردہ ہٹایا ہے۔اسی طرح ان کے ناول ''سڑک واپس جاتی ہے'' میں انھوں نے کشمیر کے ایک گاؤں کے محبت کرنے والے عاشق ومعشوق کی کہانی بیان کی ہے جو حالات سے لڑ کر بمبئی پہنچتے ہیں اور جہاں فٹ پاتھ ان کا مکمل ٹھکانہ بنتا ہے۔اس کے علاوہ ''ایک گدھے کی سرگذشت'' (1961) ، ''گدھے کی واپسی'' (1962) وغیرہ ان کے کامیاب ناول ہیں۔

بانو قدسیہ کا نام بھی اردو ناول نگاری کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔انھوں نے ''راجہ گدھ'' جیسا زندہ جاوید ناول لکھ کر اردو ادب میں انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔معاشرتی عکاسی کے نقطۂ نظر سے یہ ناول اہمیت کا حامل ہے۔اس ناول میں پاکستان کے ایک دولتمند طبقے کی زندگی سے پردہ ہٹا کر اسے بے نقاب کیا گیا ہے اور اس ناول میں دولتمند طبقے کے حرص ولالچ کو اجاگر کیا گیا ہے۔اس ناول میں سیمی شاہ جیسے نسوانی کرداروں میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اپنے والدین کو چھوڑ کر ہاسٹل میں آجاتی ہے اور گھر کے برعکس وہیں رہنا پسند کرتی ہے:

''فلسفیانہ زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو راجہ گدھ کی کہانی جبری عقیدہ پیش کرتی ہے۔انسان کو اپنے عمل اور اپنے ارادے پر اختیار نہیں۔سب کچھ مشیت کے اشارے پر پیش آتا ہے۔یہ بحث تمثیلی طور پر کہانی میں ابھری ہے۔جنگلی جانوروں اور پرندوں میں راجہ گدھ کے خلاف بغاوت کا میلان ابھرتا ہے اور یہ آواز اٹھائی جاتی ہے کہ گدھ چوں کہ مردار خور ہے اس لیے اسے جنگل بدر کر دیا جائے۔دوسرے پرندے اور جانور رزق حلال کسب کرتے ہیں اس کے برعکس گدھ کسب رزق سے گریز کرتا ہے اور مردار خوری پر قانع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس میں دیوانگی آجاتی ہے جو دوسروں کے لیے باعث خطرہ پیدا کرتی ہے''۔

(اردو ناول آزادی کے بعد، ڈاکٹر اسلم آزاد، دہلی، ص359)

اس کے علاوہ سید محمد اشرف جو کہ افسانہ نگاری میں بے حد مقبول ہوئے ''نمبردار کا نیلا'' ناول لکھ کر انھوں نے اپنے نام کو اردو کے مقبول ناول نگاروں کی صف میں کھڑا کروایا۔ان کا یہ ناول علامتی ہے۔اس ناول میں اشرف نے نیلا کو علامت بنا کر موجودہ دور کی سیاسی، سماجی صورتحال کا تجزیہ کیا ہے۔صلاح الدین پرویز کے ناول ''نمرتا'' کی اگر ہم بات کریں تو یہ ناول بھی علامتی انداز میں لکھا گیا۔اس ناول میں نہ کوئی پلاٹ ہے، نہ کوئی ایسی کہانی جو قاری پر گہرا اثر ڈالے بلکہ اس ناول میں اول سے آخر تک خیالات پریشانی کا دھندلا منظر باندھنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔اس ناول سے متعلق محمود ہاشمی لکھتے ہیں:

''صلاح الدین پرویز کی یہ تخلیق اپنے لسانی ڈھانچے اور اسلوب وآہنگ میں اس عہد کی تمام تخلیقات اور تخلیقی رویوں سے منفرد ہے۔یہ ناول ہے یا کتھا کہانی، رزمیہ، نثری شاعری ہے یا افسانہ یا ایسی بے ہیت تخلیق جو نثر اور نظم کے فرق کو مٹاتی ہے؟ یا اظہار کا کوئی ایسا نیا اسلوب جو انتہائی غیر معمولی ہے؟ یہ تمام سوالات ایسے ہیں جن پر غور کرنے کی ذمہ داری اس عہد کے ناقدوں کی ہے''

(تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، دہلی، 2007، ص261)

غضنفر کا نام بھی اردو ناول نگاری میں اہمیت کا حامل ہے۔ان کا ناولٹ ''کینچلی'' کافی مشہور ہے۔اس کے علاوہ ان کا ہر ناول زبان وبیان اور اسلوب کے نئے تجربے سے ماورا ہے۔ان کے علاوہ شموئل احمد کا ناول ''مہاماری''، عبدالصمد کا ناول ''مہا ساگر''، فیاض رفعت کا ناول ''بنارس والی گلی'' وغیرہ ایسے ناول ہیں جو معاشرتی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔

الغرض اردو ناول نے ہر دور میں انسان کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے یا اگر یہ کہا جائے تو کوئی دورائے نہیں کہ ناول نے ہر دور میں انسان کے پیچیدہ مسائل پر یا تو براہ راست یا علامتی انداز میں گفتگو کی ہے اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا ہے اور آنے والی نسل بھی اس کی تشکیل میں کوشاں ہے۔

□□□

**Shaheena Yusuf**
Research Scholar
Dept. of Urdu
Central University of Kashmir-190004

نزہت پروین

# اردو افسانے میں دلت مسائل

دلت لفظ سنسکرت زبان کے دل دھاتو سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں توڑنا، حصے کرنا، کچلنا۔ جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ سناتن دھرم میں آریوں کے عہد میں سماج کو چار طبقوں میں منقسم کیا گیا۔ برہمن، چھتریہ، ویشیہ اور شدر۔ اس تقسیم کی بنیاد منو کی تصنیف کردہ کتاب ''منواسمرتی'' پر منحصر تھی۔ ''منواسمرتی'' کے مطابق خالق کائنات بھگوان برہما نے برہمن کو اپنے مکھ سے، چھتریہ کو بازو سے، ویشیہ کو شکم سے اور شدر کو پیر سے پیدا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ برہمن ہندو سماج میں سب سے افضل مانے جاتے ہیں اور شدر کو سب سے کمتر۔ ہندو سناتن دھرم کے مطابق شدروں کا کام ان تین ذاتوں کی خدمت کرنا ہے۔ شدروں کو نہ تعلیم کی سہولت ہے، نہ اچھا کھانا، نہ اچھا پہننا، نہ اچھے گھر میں رہنا یعنی سہولیاتِ زندگی سے انھیں منع کیا گیا ہے لیکن بھگوان بدھ نے یہ نعرہ دے کر ''اپناد یپک خود بنو'' میں شدروں کو جینے کا حق دلایا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے شدروں نے بودھسٹ مذہب اختیار کر لیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد بھی شدروں کی حالت نہیں بدلی۔ کیونکہ مسلم بادشاہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کا مذہبی معاملہ ہے۔ اس لیے اس میں دخل اندازی کرنا مناسب نہیں پھر تیتوں اونچی ذات کے لوگ کسی نہ کسی طور پر مسلم بادشاہ سے جڑے ہوئے تھے۔ البتہ ایک چیز نے ان شدروں کو بے حد متاثر کیا۔ وہ تھا مسجد میں ایک ساتھ نماز ادا کرنا۔ کیونکہ شدروں کو مندروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے شدروں نے اسلام مذہب قبول کر لیا لیکن سماجی طور پر یہاں بھی ان کی کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوئی کیونکہ وہ جو کام پہلے کرتے تھے وہی کام اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کرتے رہے۔ اس لیے یہاں بھی ذات کا ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا جسے کسی بادشاہ نے دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مسلمانوں میں ذات کا تصور موجود ہے لیکن اسلام میں کہیں بھی ذات برادری کا تصور نہیں ہے۔ اسی لیے اقبال نے کہا تھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

مہاتما گاندھی نے شدروں کا نام بدل کر ہریجن کر دیا اور آزادی کے بعد آئین میں ان کے لیے جگہ مخصوص کی گئی یعنی اب یہ تعلیم بھی حاصل کر سکتے تھے۔ مندر میں بھی جا سکتے تھے۔ اب ان سے کوئی نفرت نہیں کر سکتا تھا لیکن یہ سب صرف قانون میں تھا عملی طور پر نہیں۔ گاؤں میں ان کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ ہوتا رہا اور آزادی کے 67 سال بعد بھی آج بھی کہیں کہیں یہ بھید بھاؤ دیکھنے کو مل جاتا ہے لیکن بھیم راؤ امبیڈکر نے ان ہریجنوں کو اوپر لانے کی بہت کوشش کی اور ان ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ آہستہ آہستہ ان کے اندر تبدیلی آنے لگی۔ اب یہ لوگ ہریجن کہلانا پسند نہیں کرتے تھے اس لیے ایک دوسرا نام سامنے آیا دلت۔ کمیونسٹ پارٹیوں نے بھی ان دلتوں کے اندر بیداری لانے کی بہت کوشش کی اور آج گاؤں کا جو نقشہ بدلا ہے اس میں ان کمیونسٹوں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ پارٹی دلتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لائی اور اپنا حق منوانے کے لیے احتجاج پر آمادہ کیا جس کے نتیجے میں اب ان کی طرف کوئی انگلی اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دلت تحریک مہاراشٹر سے شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ پورے

ہندوستان میں پھیل گئی۔ اس تحریک نے وہاں زیادہ زور پکڑا جہاں پر دلتوں کے ساتھ بھید بھاؤ ہو رہا تھا یا جس ریاست میں دلتوں کی تعداد زیادہ تھی جیسے بہار اور یوپی۔

پہلا دلت افسانہ کب لکھا گیا یہ کہنا مشکل ہے۔ کیا ہم گرو درونا چاریہ کے ذریعہ ایک لویہ کا انگوٹھا کاٹ لینے کو پہلا دلت افسانہ نہیں کہہ سکتے۔ جب کہ گرو درونا چاریہ نے ایک لویہ کو دھنش ودیہ نہیں سکھائی تھی۔ ایک لویہ ان کی مورت بنا کر دھنش سیکھنے سے پہلے ان کا آشیرواد لیتا تھا اور اسی آشیرواد نے اسے اس فن میں یکتا بنا دیا۔ جب درونا چاریہ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے صرف مورت کے ذریعہ آشیرواد دینے کے بدلے ایک لویہ سے اس کا انگوٹھا مانگ لیا۔

ہندوستان کی پہلی خاتون بادشاہ رضیہ سلطان اپنے ہی ایک سپاہی حبشی غلام یاقوت سے محبت کر بیٹھی جس کے نتیجے میں دونوں کو اپنی جان گنوانی پڑی۔ کیا یہ پہلا دلت افسانہ نہیں تھا؟

مہابھارت میں کورو اور پانڈو کے درمیان جو جنگ ہوئی اس کی بنیاد کیا تھی۔ دونوں کا خاندان ویاس کی اولاد ہے مگر یہ دونوں دلت ماں سے پیدا ہوئے تھے۔ کیا یہ پہلا دلت افسانہ نہیں تھا؟

چانکیہ نے ایک دلت نوجوان چندر گپت کو اس لیے مگدھ کا بادشاہ بنا دیا کیونکہ اسے برہمنوں سے بدلہ لینا تھا۔ کیا یہ پہلا دلت افسانہ نہیں تھا؟ اس طرح کی مثالیں تاریخ کے اوراق میں بھری پڑی ہیں۔ اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ پہلا دلت افسانہ کب لکھا گیا لیکن سب سے پہلے دلت فنکاروں نے سوانح عمری لکھنا شروع کیا۔ کئی سوانح عمری موجود ہیں لیکن بھیم راؤ امبیڈکر کی سوانح عمری "میں کیسے بنا" کو شاید باضابطہ پہلی دلت سوانح عمری کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امبیڈکر سے متاثر ہو کر دلت تخلیق کار سوانح عمری لکھنے کی طرف راغب ہوئے۔

ہندی ادب میں یہ بحث ابھی تک موجود ہے کہ دلت ادب بہتر طور پر کون تخلیق کر سکتا ہے۔ کیا دلت ادیب کے ذریعہ لکھی گئی تخلیق دلت ادب کہلائے گی یا غیر دلت بھی دلت ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ دلت ادیب ہی سچا دلت ادب تخلیق کر سکتا ہے کیونکہ اس کی تحریریں ذاتی تجربوں پر مبنی ہوں گی۔ جن مسائل کو وہ اٹھائے گا وہ اس کا اپنا ہوگا۔ جس کردار کو وہ پیش کرے گا اس کا دیکھا ہوا کردار ہوگا جو تجربہ اور مشاہدہ ہوگا، اس کا اپنا ہوگا۔ اس لیے اس ادب میں تاثیر اور حقیقت دونوں کھل کر سامنے آئے گی۔ سچا دلت ادیب ہی یہ کر سکتا ہے۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ غیر دلت ادیب بھی دلت ادب پیش کر سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ تاثیر، تڑپ، کسک، ناکامی، محرومی، بے بسی، استحصال، ظلم کی جھلک اسی شکل میں نہ نظر آئے جو دلت ادیب کے یہاں موجود ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سارے غیر دلت ادیبوں نے بھی بہت اچھا دلت ادب پیش کیا ہے۔

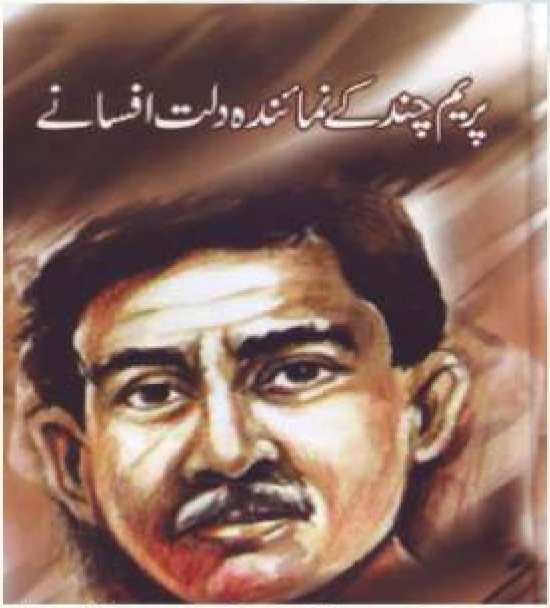


ظاہر ہے کہ دلت تحریک مہاراشٹر سے شروع ہوئی۔ اس لیے مراٹھی زبان میں دلت ادب کا بیش بہا سرمایہ موجود ہے۔ آہستہ آہستہ دوسری زبانوں نے بھی اس ادب کو اپنایا۔ اس طرح پنجابی، تیلگو، ملیالم، بنگلہ اور ہندی میں دلت ادب لکھا جانے لگا۔ ان زبانوں میں دلت ادب کا کثیر سرمایہ موجود ہے۔

جہاں تک اُردو میں دلت افسانے کا معاملہ ہے تو دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں بھی دلت افسانے کا سرمایہ موجود ہے۔ اُردو اشرافیہ کی زبان تسلیم کی جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اشراف کے ساتھ اس سماج میں ارزال بھی موجود ہے۔ مسلمانوں کے اندر بھی وہی بھید بھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے جو ہندوؤں کے یہاں موجود ہے۔ یہاں بھی گندگی اٹھانے والے موجود ہیں۔ نائی، دھوبی، سبزی فروش ہر برادری موجود ہے لیکن ہندوستان کے قانون میں انھیں دلت تسلیم نہیں کیا جاتا کیوں کہ یہ مسلمان ہیں جب کہ کام یہ دلتوں والا ہی کرتے ہیں۔ ایک بات قدرے مختلف یہ ہے کہ مسلمانوں نے ڈوم کو مہتر اور حلال خور جیسے خوبصورت الفاظ دیئے، باقی نائی، دھوبی اور سبزی فروش کے نام وہی رہے لیکن ان کا استحصال بھی اشرافیہ سماج نے اسی طرح کیا جس طرح ہندوؤں نے کیا البتہ مسجد میں ایک ساتھ نماز پڑھنے پر پابندی عائد نہیں کی گئی لیکن شادی بیاہ اور دوسرے موقعوں پر ان سے بھید بھاؤ برتا جاتا تھا اور یہ آج

بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ جہاں تک مسلم دلتوں پر ظلم کا سوال ہے تو مسلم زمینداروں اور رئیسوں کے ذریعہ ان پر بھی ظلم ہوئے ہیں۔ اس موضوع پر اُردو میں کئی افسانے مل جائیں گے جیسے واجدہ تبسم کا ''جھوٹن''، احمد ندیم قاسمی کا ''جوتا'' اور عبدل بسم اللہ کا ''علیہ دھوبی اور پاؤ بھر گوشت''۔

میں یہاں اُردو میں دلت افسانے پر بحث کر رہی ہوں۔ اس لیے جب اُردو افسانے کے سرمایہ کو کھنگالا تو معلوم ہوا کہ ہمارے اُردو افسانہ نگار بھی روایت سے کبھی پیچھے نہیں رہے ہیں۔ پریم چند نے سب سے پہلے دلت مسائل کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ اس طرح ان کے افسانے ''پوس کی رات''، ''دودھ کی قیمت''، ''ٹھاکر کا کنواں''، ''نجات''، ''گھاس والی''، ''گلی ڈنڈا'' اور ''کفن'' ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ''نجات'' اور ''کفن'' تو اُردو ادب کا شاہکار افسانہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ علی عباس حسینی نے ہمارا ''گاؤں'' لکھ کر دلت مسائل کو پیش کیا وہیں کرشن چندر نے ''کالو بھنگی'' اور ''مہالکشمی کا پُل'' لکھ کر دلت مسائل کو اجاگر کیا۔ سعادت حسن منٹو کے دو افسانے ''بھنگن'' اور ''شغل'' میں دلت کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس سے ہمدردی ہونے لگتی ہے۔ عصمت چغتائی نے ''دو ہاتھ'' میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دلت کے یہاں جنس کوئی مسئلہ نہیں، بچے کی نشو ونما کیسے ہوگی اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کے لیے یہ بچے کسی نعمت سے کم نہیں جو بڑھاپے میں ان کا سہارا بنیں گے۔

حیات اللہ انصاری نے ''ڈھائی سیر آٹا'' میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بھوک کیا ہوتی ہے۔ جس کو بھر پیٹ کھانا نہیں ملتا وہ خراب آٹے کو سڑک سے اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس سے پوریاں بناتا ہے اور پورا پریوار بھر پیٹ کھاتا ہے۔ خواجہ احمد عباس نے ''تین بھنگی'' میں دلت اور غیر دلت کردار کو پیش کیا ہے کہ ایک کائستھ کس طرح زیادہ روپیوں کے لیے اپنی برادری بدل کر بھنگی میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہیں ''میری لین'' کی پتلون میں ایک دلت کردار جو ممبئی جا کر دلتوں کے حالات کو بدلتے ہوئے تو دیکھتا ہے لیکن جب وہ اپنے آفس کی اسٹینوگرافر کملا سے شادی کرنا چاہتا ہے تو کملا کا باپ اس لیے منع کر دیتا ہے کہ وہ آفس بوائے تھا اور اس کی تنخواہ صرف اسی روپے تھی۔

احمد ندیم قاسمی نے ''موچی'' میں ایک موچی کے درد کو پیش کیا ہے کہ ایک موچی زمیندار کے لیے خوبصورت جوتا بنا تو سکتا ہے لیکن وہ اپنی شادی میں اس جوتے کو پہن نہیں سکتا۔ افسانہ ''جوتا'' میں بھی ایک دلت کردار کو پیش کیا گیا ہے جو ترقی کر کے گاؤں میں ایک اہم آدمی بن جاتا ہے کیوں کہ اس کے دونوں بیٹے بدلیس میں نوکری کر رہے تھے اور اچھی خاصی رقم اپنے باپ کو بھیج رہے تھے لیکن چودھری یہ نہیں چاہتا کہ وہ قیمتی کمبل اوڑھے۔ اس لیے چودھری سو روپے کا کمبل تین سو روپے میں خرید کر بکس میں رکھوا دیتا ہے۔

جیلانی بانو نے ''نروان'' میں ایک دلت لڑکی کے درد کو پیش کیا ہے جو اپنے سامنے رہنے والے ایک اونچی ذات کے لوگوں کے ذریعہ زدوکوب کی شکار ہوئی تھی۔ ان لوگوں نے اس کے باپ کو اس کے سامنے قتل کر دیا تھا اور اسی گھر کا لڑکا اس لڑکی سے محبت کرتا تھا لیکن آخر میں رتنما سادھوؤں کی ٹولی کے ساتھ نروان حاصل کرنے کے لیے چلی جاتی ہے۔ اختر اورینوی نے اپنے افسانہ ''لوکی والا'' میں ایک لوکی والے کی کہانی پیش کی ہے۔ شکیلہ اختر نے ''ڈائن'' میں ایک مچھلی بیچنے والی دلت بوڑھی عورت کی کہانی پیش کی ہے۔ ڈاکٹر محمد محسن نے ''انوکھی مسکراہٹ'' میں ایک گورکن کی کہانی پیش کی ہے۔ ہاجرہ مسرور نے ''کمینی'' میں ایک دلت لڑکی کے کردار کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ شمین مظفر پوری نے ''کسی سے نہ کہنا'' میں چھوا چھوت کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ غیاث احمد گدی نے ''بابا لوگ'' میں ایک بوڑھے بابا کو بہت خوبصورت کردار بنا کر پیش کیا ہے۔ انور عظیم نے ''سنیچرا'' میں ایک دلت کردار سنیچرا کو پیش کیا ہے جو اپنے مالک کے لیے اپنی جان تک گنوا بیٹھتا ہے لیکن اس کے مرنے کے بعد کوئی ایک آنسو بھی نہیں بہاتا۔ کلام حیدری نے افسانہ ''نامرد'' میں فٹ پاتھ پر رہنے والے دو میاں بیوی کے درد کو دکھایا ہے کہ اس کی بیوی کو اس کی آنکھوں کے سامنے دو پولس والے اٹھا کر لے جاتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد پھر اسی فٹ پاتھ پر چھوڑ جاتے ہیں اور اس کا شوہر اس لیے احتجاج نہیں کرتا کیوں کہ وہ غریب ہے لیکن اسی عورت کو جب دوسری بار اٹھا کر لے جایا جاتا ہے تو وہ ایس پی کا خون کر دیتی ہے۔

اقبال مجید نے ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' میں دلتوں کے احتجاج کو دکھایا ہے کہ جب ایک پروڈیوسر دلتوں کے مسائل پر فلم بنانے کے لیے اپنی ٹیم کے ساتھ ان کے گاؤں جاتا ہے اور ایک جھونپڑی کے پاس ایک دلت پریوار سے ان کے حالات جانتا ہے۔ یہ سارے لوگ اونچی ذات کے ہیں اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ بھید بھاؤ نہیں رکھتے اس لیے اس دلت پریوار سے پانی مانگتے ہیں۔ ایک آدمی ایک ٹرے میں شیشے کے گلاس میں پانی لا کر دیتا ہے تو یہ لوگ ان کے پاس رکھے المونیم کے گلاس میں پانی پیتے ہیں لیکن ایک عورت جو آگ کے پاس بیٹھی کھانا بنا رہی تھی پانی پینے کے بعد اس گلاس کو آگ میں ڈال دیتی ہے۔ کیونکہ ان اونچی ذات کے پینے سے وہ گلاس ناپاک ہو گیا تھا اور اس کو آگ میں ڈال کر اسے شدھ کر رہی تھی۔ ذکیہ مشہدی کا افسانہ ''گڑ روٹی'' میں ایک گاؤں کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔

جہاں کام کرنے پر مزدوروں کو صرف گڑ روٹی ہی دیا جاتا تھا لیکن اب حالات بدل گئے تھے جھنوا کے بیٹے نے گڑ روٹی کو زمین پر پھینک دیا کہ یہ ہماری مزدوری نہیں ہے۔ اس طرح کھل کر یہ احتجاج ہمارے سامنے آتا ہے۔

شوکت حیات نے ''مادھو'' میں پریم چند کے کردار مادھو کو آج کے حالات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ مادھو مدت کے بعد آنکھیں کھولتا ہے اور جب گاؤں پہنچتا ہے تو گاؤں کے حالات بدل چکے تھے۔ زمیندار کا ایک کتا تھا جس سے پورا گاؤں خوف کھاتا تھا۔ زمیندار نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جو اس کتے سے لڑے گا اسے دس ہزار روپیہ بطور انعام دیا جائے گا۔ مادھو کتے سے لڑنے کا اعلان کرتا ہے۔ مقابلہ کے دن پورا گاؤں اکٹھا ہو جاتا ہے اور مادھو بڑی چالاکی سے کتے کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہاں شوکت حیات نے ظلم کے خاتمے کا اعلان کیا ہے۔ کتا علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے جس زمیندار گاؤں والوں کو اپنے قابو میں رکھتا تھا لیکن مادھو نے اس ظلم کا خاتمہ کر دیا۔ حسین الحق نے ''فطری عمل'' میں ایک حلال خور کے مسائل کو اٹھایا ہے۔ سلام بن رزاق نے ''ایک لویہ کا انگوٹھا'' میں یہ دکھایا ہے کہ ساڑھے تین ہزار برس کے بعد ایک لویہ پھر ایک غریب دلت پریوار میں پیدا ہوتا ہے۔ اس بار وہ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے اور جب وہ سناتن میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے جاتا ہے تو وہاں اس کا سامنا پرنسپل کے روپ میں گرو درونا چاریہ سے ہوتا ہے۔ یہاں بھی گرو درونا چاریہ اس کے ڈاکٹر بننے کے بعد بڑی چالاکی سے اس کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا مانگ لیتے ہیں اور ایک لویہ ہنستے ہنستے دے دیتا ہے لیکن یہاں گرو درونا چاریہ دھوکا کھا جاتے ہیں کیوں کہ ایک لویہ اپنا سارا کام بائیں ہاتھ سے کرتا تھا اور وہ ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر ایک بار پھر گرو درونا چاریہ کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا افسانہ ''نور جہاں پھول جہاں اور کین کا صوفہ'' میں بھی دلت مسائل کو اٹھایا گیا ہے۔ واجدہ تبسم نے اپنے افسانہ ''جھوٹن'' میں حیدر آباد کے نوابوں اور رئیسوں کے کرتوتوں کو بڑی دلیری کے ساتھ پیش کیا ہے کہ کس طرح ان کا سارا وقت شراب نوشی اور عیاشی میں گزرتا ہے۔ انھیں ہر روز ایک نئی لڑکی چاہیے اور یہ کام ان کا وفادار نوکر کلوا کرتا ہے لیکن جب ایک دن اسے کوئی لڑکی نہیں ملتی ہے تو اپنی بیوی کو ہی ان کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور جب یہ راز کھلتا ہے تو نواب صاحب ایک مہینے کے لیے اس کی بیوی کو اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ احمد صغیر کا افسانہ ''انا کو آنے دو'' ان کا شاہکار افسانہ تسلیم کیا جاتا ہے جس میں ایک دلت کردار انا کے ذریعے پورے سماج کو بدلنے کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ انا انقلاب کی علامت ہے جو گاؤں والوں کی تقدیر بدلنا چاہتا ہے اور بدل رہا ہے۔ اس لیے گاؤں کے جل جانے کے بعد بھی پھلمتیا کہتی ہے—— ''انا کو آنے دو سالو پتہ چل جائے گا۔'' ایک بوڑھی عورت کے ذریعے یہ جملہ ادا کرنا احتجاج کی وہ آواز ہے جہاں صرف مرد ہی نہیں عورت بھی اب احتجاج کے لیے آمادہ ہے۔ اب وہ کسی سے خوف کھانے والی نہیں چاہے ان پر کوئی بھی ظلم ہو۔ وہ اس کا سامنا ڈٹ کر کر رہے ہیں اور آنے والے وقت میں سارا نظام تبدیل ہو جائے اس کے لیے جدو جہد کر رہے ہیں۔ انا ایک ایسا کردار ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے، سماج میں تبدیلی لانا چاہتا ہے اور اس کے لیے وہ گاؤں گاؤں گھوم کر لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے۔ اپنی باتیں رکھتا ہے اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔

نورالحسنین کا افسانہ ''بدذات'' ایک ایسی دلت لڑکی کی کہانی ہے جو اپنا جسم بیچ کر اپنی زندگی گزر بسر کر رہی ہے لیکن جس گھر سے وہ پانی اور پھول لیتی ہے اس گھر کا مالک اس پر بری نگاہ رکھتا ہے اور جب ایک دن اس کی بیوی میکے چلی جاتی ہے اور وہ اس کے گھر آتی ہے تو وہ اس کو بے آبرو کرتا ہے۔ آخر میں وہی لڑکی راوی کی بیوی کو خون کی کمی ہونے پر اپنا خون دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ اس طرح نورالحسنین نے ایک سوال کھڑا کیا ہے کہ بدذات کون ہے راوی یا وہ لڑکی۔

اسلم جمشید پوری کا افسانہ ''بنتے مٹتے دائرے'' میں دلت مسائل کو بڑی خوبصورتی سے اٹھایا ہے اور ان کے مسائل پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔ دیپک بدکی کا افسانہ ''موچی پہلا'' میں دلتوں کے ذریعہ دلتوں کا استحصال دکھایا گیا ہے۔ ایک دلت جب بڑا آدمی بن جاتا ہے تو اپنی بیٹی کی شادی اس لیے ایک دلت سے نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وہ اس کے برابر کا نہیں تھا۔ جب کہ اس کی بیٹی اور وہ لڑکا دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے محبت کرتے تھے اور جب اس لڑکی کی شادی اس کا باپ دوسرے لڑکے سے کر دیتا ہے تو گاؤں والے اسے اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں اور اس کے پشتینی مکان کو خاکستر کر دیتے ہیں۔ انور قمر نے ''چاندنی کے سپرد'' میں غلاظت میں جی رہے ایک کردار کلوا کو پیش کیا ہے۔ مجیر احمد آزاد نے افسانہ ''ڈوم'' میں ڈوم کے کردار کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

عبدل بسم اللہ کا افسانہ ''علیہ دھوبی اور پاؤ بھر گوشت'' میں مسلمانوں کے ذریعہ مسلمانوں کا استحصال دکھایا گیا ہے۔ یہ جگ ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں کوئی چھوا چھوت، بھید بھاؤ، اونچ نیچ نہیں ہوتا لیکن جس گاؤں میں علیہ دھوبی رہتا ہے وہاں ان کے ساتھ خان صاحب دلتوں جیسا سلوک اختیار کرتے ہیں۔ انھیں اپنے یہاں شادی میں دعوت تو دیتے ہیں

لیکن دلتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پڑتا ہے۔ یوسف کا بیٹا علیہ اپنی برادری کے لوگوں کو اکٹھا کر کے اپنے حق میں کر لیتا ہے۔ علیہ کا باپ یوسف جب اپنی بیٹی کی شادی کرتا ہے تو وہ پہلی بار خان صاحب لوگوں کو دعوت بھیجواتا ہے ان لوگوں نے دعوت تو قبول کر لی لیکن یہ کہا کہ ایک ایک آدمی پر ایک ایک پاؤ گوشت بھجوا دے۔ اب اس دن سے اس گاؤں کی یہ روایت بن گئی تھی کہ کسی بھی دھوبی کے گھر شادی ہوتی تو خان صاحب کے گھر ایک ایک آدمی پر ایک ایک پاؤ گوشت بھجوا دیا جاتا۔

علیہ دھوبی اپنی برادری کو اکٹھا کر کے ہیرو بن جاتا ہے۔ اب اس کی برادری کے لوگ کہیں شادی میں بھی جاتے تو بغیر اس سے پوچھے نہیں جاتے۔ یعنی وہ جو بھی کام کرتے اس میں علیہ دھوبی کا دخل ہوتا۔ اس طرح جب خان صاحب نے علیہ دھوبی کو اپنے بیٹے کے ولیمہ کا دعوت نامہ بھیجا تو اس نے دعوت تو قبول کر لی لیکن نائی سے کہلوایا کہ خان صاحب سے کہہ دیجئے گا کہ اب وہ کسی کے گھر دعوت کھانے نہیں جاتے۔ اس لیے ایک ایک پاؤ گوشت ایک ایک آدمی پر بھجوا دیں۔ یہاں احتجاج کی ایک نئی صورت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

یہاں میں نے جتنے افسانوں پر روشنی ڈالی ہے یہ سبھی افسانے دلت مسائل کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کے افسانہ نگار بھی اس موضوع سے اچھوتے نہیں رہے اور نہ ہی کبھی روایت سے انحراف کیا۔ جب بھی دلت افسانے کی بات ہوگی تو اُردو میں بھی ان دلت افسانوں کو سامنے رکھا جائے گا۔ پریم چند نے جہاں دلت افسانے کی شروعات کی، بعد کے افسانہ نگاروں نے بھی اس موضوع پر افسانے لکھے اور کامیاب افسانے لکھے۔ چاہے وہ کرشن چندر کا ''کالو بھنگی'' یا ''مہالکشمی کا پُل'' ہو یا راجیندر سنگھ بیدی کا ''تلادان''، سعادت حسن منٹو کا ''بھنگن''، خواجہ احمد عباس کا ''تین بھنگی'' یا احمد ندیم قاسمی کا ''جوتا''۔ اُردو افسانے کے جتنے اہم افسانہ نگار ہیں تقریباً سبھی نے دلت مسائل پر افسانے قلم بند کیے ہیں اور آج بھی ان مسائل پر اسی طرح افسانے لکھے جا رہے ہیں جس طرح دوسری زبانوں میں لکھے جا رہے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان دنوں اُردو میں دلت مسائل پر زیادہ افسانے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔

ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اُردو میں لفظ دلت تو نہیں ہے لیکن لفظ ارزال موجود ہے جو دلت کا ہم معنی ہے اور وہی مسئلہ یہاں بھی موجود ہے اور ہمارے افسانہ نگاروں نے ان کرداروں کو سامنے رکھ کر بہت ہی خوبصورت افسانے تحریر کیے ہیں۔

اُردو میں جتنے دلت مسائل پر افسانے لکھے گئے وہ یقیناً اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ اس میں دلت مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ چاہے وہ پریم چند کا افسانہ ''کفن''، ''نجات''، ''پوس کی رات''، ''ٹھاکر کا کنواں'' وغیرہ ہو یا کرشن چندر کا ''مہالکشمی کا پُل'' یا ذکیہ مشہدی کا ''مچھندر کی واپسی''، انور عظیم کا ''او نگھتی ڈیوڑھی جاگتے کھیت'' یا احمد صغیر کا ''اتا کو آنے دو''۔ ہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اُردو کے افسانہ نگار دلت پریوار سے نہیں آتے البتہ غریبی اور امیری کی بنیاد پر دو طبقہ ضرور ملتا ہے لیکن ان پر افسانے کم ملتے ہیں۔ صرف احمد ندیم قاسمی کا ''جوتا''، ڈاکٹر محمد محسن کا ''انوکھی مسکراہٹ'' اور عبدل بسم اللہ کا ''علیہ دھوبی اور پاؤ بھر گوشت''۔ اُردو میں بھی جو دلت افسانے لکھے گئے اس میں زیادہ تر کردار دلت ہی ہیں چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو اور ان کرداروں کو اُردو کے افسانہ نگاروں نے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

جب ہم کرداروں کی بات کرتے ہیں تو پریم چند کے افسانہ ''کفن'' کا مادھو اور گھیسو آج بھی زندہ نظر آتے ہیں۔ مہالکشمی کے پُل پر ٹنگی ہوئی سات ساڑیاں، سات عورتوں کے مسائل کی آج بھی یاد دلا رہی ہیں۔ ''دو ہاتھ'' کا رام اوتار کا کردار آج بھی ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ خواجہ احمد عباس کا ''میری لین کی پتلون'' کا کردار منگو آج بھی یہ پوچھ رہا ہے کہ بدلاؤ کہاں آیا ہے۔ نوکر پیشہ ہونے کے باوجود بھی میری شادی کملا سے اس لیے نہیں ہو سکتی کہ وہ اسٹونوگرافر ہے اور میں آفس بوائے۔ ''بابا لوگ'' کا بابا آج بھی لوگوں کے ذہن میں موجود ہے اور انور عظیم کا ''سنیچرا'' کو ہم بھلا کیسے بھول سکتے ہیں۔ وہیں احمد صغیر کا اتا آج بھی گاؤں میں نظر آ جائے گا۔ یہ وہ کردار ہیں جو زندہ جاوید کردار ہیں۔ جب بھی اُردو میں دلت کرداروں کی بات ہوگی یہ سارے کردار خود بخود اُٹھ کر ہمارے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُردو کے افسانہ نگاروں نے بھی دلت کرداروں کو جس طرح نکھارا ہے وہ یادگار بن گئے ہیں۔

اُردو کے افسانہ نگاروں نے دلت مسائل کو سرسری طور پر نہیں لیا ہے، اس کے ساتھ انصاف کیا ہے بلکہ اس میں ڈوب کر افسانہ لکھا ہے۔ جب ہم پریم چند کا افسانہ ''کفن'' پڑھتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کفن کے لیے اکٹھا کیے گئے روپے سے مادھو اور گھیسو نہ صرف شراب پی جاتے ہیں بلکہ لذیذ کھانا بھی کھاتے ہیں کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ بدھیا کو کفن تو مل جائے گا لیکن ان کو اس طرح کا لذیذ کھانا اور شراب نہیں ملے گی۔ یہ ایسا موضوع ہے جو ہمیں بار بار جھنجھوڑتا ہے۔ اس افسانے پر دلت ناقدین لاکھ اعتراض کریں کہ پریم چند نے دلتوں کا مذاق اُڑایا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بدھیا کی موت ہی ان کے لیے نجات کا راستہ تھا۔ وہیں ''کالو بھنگی'' میں کرشن چندر نے ایک بھنگی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ سب کے دکھ درد

میں شامل رہتا ہے لیکن اس کی موت کے بعد کوئی ایک آنسو بھی نہیں بہاتا۔ بیدی کے افسانہ ''تلادان'' میں بابو نام کا دلت لڑکا چاہتا ہے کہ اسے بھی تلادان میں تولا جائے اور وہ اناج سکھ نندن کی ماں کو دان دیا جائے۔ میں نے جتنے افسانوں کا یہاں مطالعہ پیش کیا ہے ان سب کا موضوع ایسا ہے جسے ہم سرسری طور پر نہیں لے سکتے۔ سبھی افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر لکھا ہے اور موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

میں نے اُردو کے اہم دلت افسانوں کا یہاں تجزیہ پیش کیا ہے جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو میں بھی دلت افسانے لکھے گئے اور اہم افسانے لکھے گئے جو ان افسانہ نگار کی پہچان بن گئے۔ جیسے پریم چند کی پہچان ان کا افسانہ ''کفن'' ہے تو کرشن چندر کی پہچان ''کالو بھنگی'' اور مہالکشمی کا پُل، عصمت چغتائی کا ''دو ہاتھ''، خواجہ احمد عباس کا ''میری لین کی پتلون''، احمد ندیم قاسمی کا ''جوتا''، غیاث احمد گدی کا ''بابا لوگ''، انور عظیم کا ''اونگھتی ڈیوڑھی جاگتے کھیت'' اور احمد صغیر کا انا کو آنے دو''۔ یہ وہ افسانے ہیں جن سے اس افسانہ نگاروں کو پہچانا جاتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ ان کے اور اہم افسانے نہیں ہیں لیکن جب دلت افسانے کی بات ہوگی تو یہ افسانے ان کی پہچان کے طور پر دیکھے جائیں گے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو میں جتنے دلت افسانے لکھے گئے ہیں اس کا ایک مکمل انتخاب شائع کیا جائے۔ ان افسانوں کا تجزیہ پیش کیا جائے اور دوسری زبانوں کے دلت افسانوں سے اُردو دلت افسانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آسکے کہ اُردو میں لکھے گئے دلت افسانے کس مقام پر ٹھہرتے ہیں۔

□□□

**Nuzhat Perween**
"Haneef Manzil"
Koyli Pokhar, Police Line
Gewal Bigha, Gaya-823 001 (BIHAR)

**Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"**

## سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............................ بتاریخ............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ..........................................................................

پتہ : ..........................................................................

..........................................................................

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

خواجہ عبدالمنتقم

# خواتین کی ترقی میں مذہب کوئی رکاوٹ نہیں

مختلف مذاہب اور تہذیبوں میں، خواہ کوئی بھی مذہب یا تہذیب اس بات کا دعویٰ کرے کہ اس نے عورت کو ہر معاملے میں برابر کا حق دیا ہے زمینی حقیقت سے انحراف کے مترادف ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ملک ہو، کوئی بھی تہذیب ہو، کوئی بھی معاشرہ ہو اور کوئی بھی ثقافت، عورتوں کی معاشی، معاشرتی وعائلی حیثیت ثانوی رہی ہے۔ خواہ مقدس کتابوں دھرم گرنتھوں دساتیر ودیگر قوانین میں ان کو برابری کا درجہ کیوں نہ دے دیا گیا ہو۔ البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں یا گذشتہ دوصدیوں میں قوانین کی تدوین کے بعد مختلف مذاہب کی خواتین کے ساتھ تفریقی رویے میں کافی کمی آئی ہے کیونکہ قوانین پر مذاہب کا رنگ بتدریج کم ہوتا چلا جارہا ہے اور عورت وقت گزرنے کے ساتھ بااختیار ہوتی جارہی ہے۔ آیئے اب ہم ہندوستان کے دو بڑے مذاہب یعنی ہندو مذہب اور اسلام میں عورت کی حیثیت کا مختصر جائزہ لیتے ہیں:

### ہندو مذہب

دنیا کے دیگر مذاہب کی طرح ہندو مذہب میں بھی خواتین کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ منواسمرتی کے مطابق بچپن میں اس کی حفاظت والدین کرتے ہیں، جوانی میں اس کا شوہر اور بڑھاپے میں اس کے بیٹے۔ ویدک دور کو ہندو خواتین کے حوالے سے ایک سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ وہ اس زمانے میں سماجی امور اور دیگر سرگرمیوں میں مردوں کی طرح سرگرم عمل رہتی تھیں۔ اس دور میں انھوں نے گروکل میں ویدوں کی تعلیم حاصل کی، ناچ گانے میں مہارت حاصل کی۔ آرٹ اور دیگر فنون میں مکمل دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ یہاں تک کہ میدان جنگ میں کس طرح اپنے جوہر دکھائے جاتے ہیں اس سے متعلق تمام گر سیکھے۔ اس دور میں ان پر پردے وغیرہ کی بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس دور میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج بہت ہی کم تھا اور اگر تھا بھی تو صرف حکمراں طبقے میں۔ جہاں تک جہیز کی بات ہے اس کا رواج صرف شاہی خاندان تک محدود تھا اور وہ بھی صرف منقولہ تحائف کی شکل میں۔ ان کے لیے کسی بھی طرح کی مانگ نہیں کی جاتی تھی۔ بیواؤں کو شادی کرنے یا نیوگ کا راستہ اپنانے کی اجازت تھی۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ کسی بھی طرح کا امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ لڑکیوں کو دو درجات میں رکھا جاتا تھا۔ پہلی برہم وادنی جو مقدس دھاگہ باندھتی تھیں اور جنھیں دیگر مقدس فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ویدوں کی تعلیم بھی حاصل کرنی ہوتی تھی۔ دوسرے درجہ میں ان لڑکیوں کو رکھا جاتا تھا جنھیں یہ سب کچھ رسمی وعلامتی طور پر دیا جاتا تھا اور وہ بھی شادی سے عین قبل۔ ان سے ان کے شوہر گھر گرہستی کا کام لیتے تھے۔ اس دور کے بعد 1500 قبل از مسیح تا 500 بعد از مسیح دور میں منو کے ذریعہ ان کے حقوق اور مراعات پر کچھ پابندیاں ضرور عائد کی گئیں۔ آہستہ آہستہ یہ پابندیاں ختم ہوتی چلی گئیں اور آج کی ہندو عورت زندگی کے ہر شعبے میں مرد کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے۔ اسے دیر آید درست آید کے مصداق حقوق وراثت بھی حاصل ہو چکے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں سرگرم عمل ہے۔ آج وہ

ہندوستانی فوج کا حصہ بھی ہے، انفارمیشن ٹیکنالوجی، سیاست، صنعت، صحت ودیگر میدانوں میں پورے جوہر دکھارہی ہے اور اس پر ایسے جوہر دکھانے کے لیے کوئی مذہبی پابندی نہیں حالانکہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاہنوز دلّی دوراست۔ ابھی مردوں کے برابر آنے کے لیے اسے ایک طویل مسافت طے کرنی ہوگی۔

**اسلام**

جہاں تک اسلام میں عورت کے مقام کی بات ہے اس بات کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت میں بالعموم عورت کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ بدوی قبائل میں عورت کو کوئی حیثیت ہی حاصل نہ تھی۔ عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی مانند سمجھا جاتا تھا انھیں اپنے اوپر کوئی اختیار نہ تھا۔ مرد جس طرح چاہتے ان سے سلوک کرتے تھے۔ اس دور میں عورت کو بھی گھوڑوں اور مال اسباب کی طرح ترکہ میں تقسیم کرتے تھے۔

اسلام نے آکر اخلاق اور تہذیب وتمدن کا وہ اعلیٰ معیار قائم کیا جو آج تک اقوام عالم کے لیے مشعل راہ ہے۔ اسلام جہاں عورت کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور اس سے مروت کے ساتھ پیش آنے کی تلقین کرتا ہے وہاں اس سے شفقت، محبت اور پیار کا سلوک کرنے پر بھی زور دیتا رہا۔ اسلام نے عورت کو ہر قسم کے حقوق سے نوازا اور ہر طبقے کی عورتوں کے لیے عام کردیا۔ ان حقوق اور مراعات کی بدولت ایک عام مسلمان عورت کا مرتبہ، زمانہ جاہلیت کے معزز ترین قبیلے کی عورت سے بھی بلند وبالا ہوگیا۔ اسلام نے عورت کو حقیر نہیں سمجھا اس نے عورت کے جذبات واحساسات کا خیال رکھتے ہوئے اس کے حقوق قائم کرکے اس کی خودی کو بلند کردیا۔ چنانچہ فرمان خداوندی ہے ”جس طرح عورتوں کے ذمہ مردوں کے کچھ حقوق واجب ہوتے ہیں اسی طرح مردوں کے ذمہ عورتوں کے کچھ حقوق ہیں۔“ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے ”اپنی بیویوں سے نیک سلوک کرو اگر کسی وجہ سے تمھاری طبیعت ان سے برگشتہ ہونے لگے تو نفرت کے اس جذبے کو ختم کرنے کی کوشش کرو کیونکہ ہوسکتا ہے تم کسی چیز سے نفرت کرتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں تمھارے لیے بھلائی مقدر کی ہو۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم کو عورتوں سے حسن سلوک کی جتنی تاکید فرمائی تھی اس کا اندازہ حضور کی اس حدیث پاک سے ہوسکتا ہے۔ جس میں آپ فرماتے ہیں ”جبریلؑ نے مجھے عورتوں کے بارے میں اتنی شدت سے احکام دیے کہ میں نے خیال کیا کہ کہیں وہ طلاق کی حرمت ہی کا حکم نہ لے آئیں۔“

ایک دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے ”اے ایمان والو تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم عورتوں کی مرضی کے خلاف انھیں مال وراثت سمجھ کر اپنے قبضہ میں کرو۔“

یہ ہے وہ قدر ومنزلت، جسے عورت نے اسلامی شریعت کے تحت حاصل کیا اور یہ ہے وہ اسلامی تعلیم جس پر عمل کرنا تمام مسلمانوں کے لیے

لازمی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مسلمان عورتوں کے بارے میں اسلامی تعلیم پر عمل کریں تو عورتوں کو ان حقوق سے بھی بہت زیادہ حقوق مل جائیں جن کا وہ آج اپنے لیے مطالبہ کر رہی ہیں۔

ہندوستان میں مسلم خواتین زندگی کے ہر شعبے میں اپنی غیر مسلم بہنوں کے مقابلے میں کافی حد تک پسماندہ ہیں۔ ان کے سامنے بہت سے مسائل ہیں مگر دو اہم مسائل نے انھیں زیر آتش پا کر دیا ہے۔ یعنی تعلیمی و عائلی مسائل۔ دقیانوسیت اور جدیدیت کے بیچ سینڈوچ بنی مسلمان عورت ایک دوراہے پر کھڑی ہے مسلمانوں کا ایک طبقہ اسے صرف گھر کی چہار دیواری کے اندر مقید رکھنا چاہتا ہے تو دوسرا طبقہ اسے شمع محفل بنا کر واہ واہی لوٹنا چاہتا ہے جب کہ ضرورت اعتدال پسندی کی ہے۔

2011 کی مردم شماری کے مطابق مسلم خواتین کی شرح خواندگی 59.1 فیصدی ہے جب کہ ہندو خواتین کی شرح خواندگی 65.1 فیصدی ہے اور جین خواتین کی شرح خواندگی 94.1 فیصدی ہے عیسائی، سکھ و بودھ خواتین کی شرح خواندگی بالترتیب 80.3 فیصدی، 69.4 فیصدی و 72.7 فیصدی ہے۔ مسلم خواتین کی یہ شرح خواندگی صرف قرآن کریم پڑھنے اور بنیادی دینی تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے ہے ورنہ اگر روزگار کے نقطۂ نظر سے شرح خواندگی کا تعین کیا جائے تو شاید یہ شرح ایک فیصدی یا اس کے آس پاس ہی آئے گی۔ یہ صورت حال تو اس وقت ہے جب یہ صریح حدیث ہے کہ ’’علم حاصل کرو چاہے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے‘‘ یہاں چین سے مراد دور دراز علاقہ ہے۔ یہ دعوت علم صرف مردوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سب کے لیے ہے اور علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر لازم ہے۔ یہاں تعلیم سے مراد صرف مذہبی تعلیم ہی نہیں بلکہ ہر طرح کی تعلیم مراد ہے۔ کیا ایک ڈاکٹر مریضوں کا علاج کر کے بہترین خدمت خلق انجام نہیں دیتا؟ کیا اس کو اس خدمت خلق کا اجر نہیں ملے گا؟ کیا ایرانی و مصری خواتین اعلیٰ تکنیکی تعلیم حاصل کر کے متعلقہ میدان میں بلندیوں کو نہیں چھو رہی ہیں؟ اب تو خود ہمارے ملک میں بھی مسلم بچے اور بچیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو رہے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ حال ہی میں الہ آباد کے ایک اوسط درجے کے خاندان کی مسلمان لڑکی عائشہ سعید نے Indian statistical service میں پہلا مقام حاصل کیا ہے۔ مگر پھر بھی اگر کچھ جنونی لوگ مسلم بچیوں اور خواتین کو صرف گھر کی چہار دیواری میں مقید کر کے تعلیم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں تو ان کی مرضی۔ شاید اس قسم کے مسلمان آج پھر مسلمانوں کو عہد جاہلیت میں واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ آج دنیا کے بیشتر ممالک میں زیادہ تر قوانین سیکولر ہیں اور ان کی بنیاد جنس یا مذہب پر نہیں ہے۔ لہٰذا مسلم خواتین کو بھی وہ تمام مواقع حاصل ہیں جو غیر مسلم خواتین کو حاصل ہیں۔ اگر اس ضمن میں مثبت رویہ اختیار نہیں کیا گیا تو ہماری آنے والی نسلیں اچھی ماؤں سے محروم ہو جائیں گی اور وہ بدلتے ہوئے تکنیکی تعلیمی نظام میں اپنے بچوں کی صحیح پرورش نہیں کر پائیں گی۔ اس سے نہ صرف مسلمانوں اور ہندوستان کا نقصان ہوگا بلکہ دنیا میں بڑھتی ہوئی غربت اور ناانصافی میں مزید اضافہ ہوگا۔

مسلمانوں کا دوسرا مسئلہ ان کے عائلی مسائل ہیں چونکہ اسلام ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت دیتا ہے اور اس کے ساتھ شوہر کو بآسانی طلاق دے کر رشتہ ازدواج ختم کرنے کا حق دیتا ہے (حالانکہ ان دونوں حقوق کے من مانے استعمال کی ممانعت کی گئی ہے اور یہ حقوق کچھ مخصوص حالات میں اور کچھ مخصوص شرائط کے تابع عطا کیے گئے ہیں)۔ کچھ دین سے ناواقف لوگ گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے معمولی سی بات پر اپنی بیویوں کو طلاق دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں، طلاق دے دیتے ہیں۔ تشدد آمیز رویہ اختیار کرتے ہیں، دوسری شادی کرنے کی بات کرنے لگتے ہیں یا کر لیتے ہیں، بے چاری عورت کو ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے کئی طرح کے مسائل سے الجھنا پڑتا ہے۔ حالانکہ ایسی صورت میں اس کو خلع کا بھی حق حاصل ہے مگر ہمارا پسماندہ معاشرہ اس قسم کی عورتوں کو گری ہوئی نظر سے دیکھتا ہے اور طلاق کے بعد ان کی دوسری شادی بھی انتہائی مشکل سے ہو پاتی ہے۔ اس صورت حال سے کس طرح نمٹا جائے اس پر دینی و ملی ادارے باہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس اہم مسئلے کو علمائے دین و مفتیان کرام بتقاضائے وقت و حالات سلجھانے کی حتی المقدور جدوجہد کریں تاکہ خواتین کے ساتھ کسی طرح کی کوئی زیادتی نہ ہو اور اسلام میں جو انھیں مقام دیا گیا ہے وہ اس مقام کو صحیح معنوں میں حاصل کر سکیں۔

معاشرے میں گرتی ہوئی اقدار کے ساتھ مسلمانوں میں بھی خانگی تشدد، شوہر، ساس سسر اور دیگر اعزا کی جانب سے ہونے والی زیادتیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ سسرال والے بہو کو بیٹی بنا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں لیکن بیٹی تو بیٹی اسے بہو کا بھی کما حقہ حق نہیں دیتے۔ اپنی بیٹی کو رانی اور بہو کو نوکرانی کا درجہ دینے میں یقین رکھتے ہیں، کبھی جہیز کی مانگ کرتے ہیں، کبھی اس کی شخصی آزادی پر پابندیاں لگاتے ہیں۔ کبھی اسے تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ لہٰذا ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام تک یہ بات پہنچائیں کہ اب حکومت نے اس قسم کے لوگوں کو سزا دلانے کے لیے ’’خانگی تشدد سے خواتین کا تحفظ ایکٹ 2005‘‘ کی شکل میں ایک

قانون بنا دیا ہے۔ جس کی رو سے اس قسم کے جرائم کرنے والوں کو سزا دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ دینی مبلغین کو بھی چاہیے کہ وہ نماز، روزے اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی تلقین کریں کہ اس قسم کا رویہ اختیار کرنے یعنی تشدد آمیز رویہ ومطالبہ جہیز کے لیے انھیں جہیز کے قانون اور متذکرہ بالا قانون کے تحت سزا مل سکتی ہے اور آخرت میں بھی ان کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ بہت سی عورتیں بھی اپنے ناروا رویہ سے فریق ثانی کی زندگی اجیرن بنا دیتی ہیں مگر عنوان بالا کے تحت یہاں یہ مسئلہ موضوع بحث نہیں ہے۔ آیئے اب ہم مسلم خواتین کو حاصل حقوق وراثت کی مختصر تفصیل درج کرتے ہیں۔

**خواتین کو حقوق وراثت**

اسلام نے عورتوں کو جس طرح وسیع تمدنی ومعاشی حقوق دیے ہیں اور عزت وشرف کے جو بلند مراتب عطا کیے ہیں اور ان حقوق ومراتب کی حفاظت کے لیے جو پیمانے مقرر کیے ہیں اور پائیدار ضمانتیں مہیا کی ہیں ان کی نظیر دنیا کے کسی قدیم وجدید نظام میں مشکل سے ہی ملے گی۔ اسلام دنیا کے ان مذاہب میں سے ہے جنھیں عورت کو حق وراثت عطا کرنے کے معاملے میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات تمام دنیا تسلیم کرتی ہے اور اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ عدالت کی بے شمار نظیریں اور ماہرین کی آرا اس کا دستاویزی ثبوت ہیں۔ اسلام میں عورت کو ہر قسم کی جائیداد میں حق وراثت حاصل ہے خواہ وہ جائیداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ، خود حاصل کی ہو یا موروثی جائیداد ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ عورتوں کو جائیداد میں مردوں کی بہ نسبت کم حصہ ملتا ہے۔ چونکہ اسلام میں عورت کے تمام ضروری اخراجات زندگی کی ذمہ داری مرد پر رکھی ہے، اس لیے مرد اور عورت کے حصے میں فرق رکھا گیا ہے۔ دہلی ہائی کورٹ کے سبکدوش چیف جسٹس جناب راجندر سچر نے جنھیں سچر کمیٹی کے حوالے سے ہر شخص جانتا ہے اب سے کئی دہائی پہلے کہا تھا:

’’تاریخی اعتبار سے اسلام عورتوں کو جائیداد کے حقوق دینے کے معاملے میں بہت فراخ دل اور ترقی پسند رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ 1956 میں ہندو کوڈ منظور ہونے سے پہلے خواتین کو جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا جب کہ اسلام عورتوں کو یہ حقوق 1400 سال پہلے دے چکا تھا۔‘‘

(روزنامہ اسٹیٹسمین مورخہ 26 اپریل 1986)

حضور اکرمؐ نے سجدہ کو جو اہمیت دی اور زوجین کے مابین محبت کے پیمانے کا جو تعین کیا اس کا اندازہ آپ کے اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو بیوی کو اپنے شوہر کے لیے ایسا کرنے دیتا۔ قرآن کریم میں واضح حکم ہے کہ چاند سورج کو سجدہ نہ کرو بلکہ صرف اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔

قرآن کریم میں وراثت سے متعلق درج ذیل جن ہدایات سے باخبر کیا گیا ہے ان کی رو سے اقارب اور ان کے حصوں کی تفصیل اس طرح

ہے:

اقارب میں سب سے پہلے اولاد کے حصہ کو بیان فرمایا کہ اگر کسی میت کی اولاد بیٹا، بیٹی دونوں ہوں تو ان کی میراث دینے کا یہ قاعدہ ہے کہ ایک بیٹا دو بیٹیوں کے برابر حصہ پائے گا مثلاً اگر ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوں تو نصف مال بیٹے کا اور نصف دونوں بیٹیوں کا ہوگا اور اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوگی تو دو ثلث بیٹے کا اور ایک ثلث بیٹی کا ہوگا۔ اگر کسی میت نے اولاد میں صرف عورتیں یعنی بیٹیاں ہی چھوڑیں بیٹا نہیں چھوڑا تو وہ اگر دو سے زیادہ ہوں تب بھی ان کو دو تہائی ملے گا اور اگر صرف ایک ہی بیٹی چھوڑی تو اس کو میت کے ترکہ کا نصف ملے گا۔ جاننا چاہیے کہ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ کے ذیل میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایک بیٹی کو ایک بیٹے کے ساتھ ایک ثلث ملے گا تو اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک بیٹی کو دوسری بیٹی کے ساتھ بطریق اولیٰ ایک ثلث ملے گا کیونکہ بیٹے کا حصہ بیٹی سے زائد ہے تو جب بیٹے کی وجہ سے اس کا حصہ ایک ثلث سے کم نہیں ہوا تو دوسری بیٹی کی وجہ سے کیسے گھٹ سکتا ہے۔ سو دو بیٹیوں کا حکم چونکہ پہلی آیت سے معلوم ہو چکا تھا اس لیے اس آیت میں دو بیٹیوں سے زائد کا حکم بتلا دیا تا کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ دو بیٹیوں کا حق جب ایک بیٹی سے زائد ہے تو شاید تین یا چار بیٹیوں کا حق دو بیٹیوں سے زائد ہوگا اس لیے یہ بات ہرگز نہیں بلکہ بیٹیاں جب ایک سے زائد ہوں گی دو ہوں یا دس ان کو دو ثلث ملے گا۔

فائدہ:- اولاد کے وارث ہونے کی دو صورتیں آیت میں مذکور ہوئیں اول یہ کہ لڑکا اور لڑکی دونوں طرح کی اولاد ہو۔ دوسری یہ کہ صرف دختری اولاد ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک لڑکی ہو یا ایک سے زائد تو اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی وہ یہ کہ صرف پسری اولاد ہو سو اس کا حکم یہ ہے کہ تمام میراث اس کو مل جائے گی خواہ ایک بیٹا ہو یا زائد۔

اب ماں باپ کی میراث کی تین صورتیں یہاں فرماتے ہیں۔

صورت اول کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر میت کی اولاد ہو بیٹا یا بیٹی تو میت کے ماں باپ کو ترکہ میت میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کی اولاد کچھ نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو اس کی ماں کو ایک ثلث ملے گا یعنی باقی دو ثلث اس کے باپ کو ملیں گے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں خواہ حقیقی ہوں یا صرف باپ یا صرف ماں میں شریک ہوں اور اولاد کچھ بھی نہیں تو اب اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا یعنی باقی سب اسی کے باپ کو ملے گا۔ بھائی بہن کو کچھ نہ ملے گا اور اگر صرف ایک بھائی یا ایک بہن ہوگی تو ماں کو ایک ثلث اور باپ کو دو ثلث ملیں گے جیسا کہ دوسری صورت مذکورہ بالا میں تھا۔

اب زوجین کی میراث کو بیان فرمایا جاتا ہے کہ مرد کو اس کی عورت کے مال میں سے آدھا مال ملے گا اگر عورت کے کچھ اولاد نہ ہو اور اگر عورت کے اولاد ہے خواہ ایک ہی بیٹا یا بیٹی ہو اور اسی مرد سے ہو یا دوسرے مرد سے تو مرد کو عورت کے مال میں سے ایک چوتھائی مال ملے گا قرض اور وصیت کے بعد۔ اور اسی طرح عورت کو اس کے خاوند کے مال میں سے چوتھائی حصہ ملے گا اگر مرد کی اولاد کچھ نہ ہو اور اگر مرد کے اولاد ہے خواہ اسی عورت سے یا دوسری عورت سے تو عورت کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ خاوند کے اس مال میں سے جو وصیت اور قرض ادا کرنے کے بعد بچے گا۔ مال کی ہر قسم میں سے نقد ہو یا جنس سلاح ہو یا زیور، حویلی ہو یا باغ، باقی رہا عورت کا ہر وہ میراث سے جدا ہے وہ قرض میں داخل ہے یہ کل دو صورتیں ہوئیں جیسا کہ مرد کی میراث میں یہی دو صورتیں تھیں۔

(ماخوذ تفسیر قرآن پارہ:4، رکوع:13، سورۃ النساء)

(خواتین کی اختیار کاری و صنفی مساوات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان)

□□□

# حاصل لاحاصل

مسرور جہاں

یہ اس کی بدنصیبی تھی کہ ماں باپ اچانک ہی ایک ایکسیڈنٹ میں ختم ہوگئے اور دنیا میں اس کا واحد قریبی رشتہ چچا کا رہ گیا۔ والدین کا چالیسواں ہوگیا تو چچا اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اسے دیکھ کر چچی نے ایسی بھیانک چیخ ماری جیسے کسی نے ان پر شکاری کتے چھوڑ دیے ہوں۔

'اس مصیبت کو آپ گھر کیوں لے آئے؟'

چچی نے بلبلا کر کہا۔

'پھر کیا اسے تنہا چھوڑ دیتا؟۔ ماں باپ تو رہے نہیں پھر یہ کہاں جاتی؟' چچا نے احسان سے کہا۔

'کیا ہم نے دنیا بھر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ یا ہمارا گھر یتیم خانہ ہے؟'

چچی نے دل لگتی بات کہی۔

'سب کا نہیں۔ لیکن کسی اپنے کا لینا پڑتا ہے۔ میرا مطلب ہے ٹھیک۔ میں اس کا سگا چچا ہوں اور یہ بات ساری دنیا جانتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے علاوہ کیا چارہ تھا کہ میں اس کی سرپرستی کروں؟'

'کیا ننھیال میں سب مرگئے تھے؟ جو آپ......؟'

'اس سے ہمارا خونی رشتہ ہے۔ ننھیال والوں سے کیا لینا دینا۔ یہ ہماری عزت کا بھی سوال ہے جو تم سمجھنا نہیں چاہتیں؟۔ چچا نے طنز کیا۔ چچی اور زیادہ بلبلائیں۔

'اور یہ جو چار جانیں بلکہ جونکیں پہلے سے ہمارا خون چوس رہی ہیں ان کا کیا ہوگا؟'۔

'جیسے پہلے چوستی تھیں۔ میرا مطلب ہے خون...... ویسے ہی اب بھی چوسیں گی اور جو آئی ہے وہ اپنی قسمت کا رزق لے کر آئی ہے۔ میرا یا تمھارا کوئی احسان نہیں ہے اس پر اس لیے واویلا کرنا بند کرو'

'کہاں کا رزق کیسا رزق؟ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں'۔

چچی نے بھنا کر کہا۔ بس چلتا تو آنے والی کا گلا گھونٹ دیتیں۔

''سامعہ یہیں رہے گی۔ ہمارے پاس۔ کیونکہ میرے سوا اس کا قریبی عزیز اور کوئی نہیں ہے اور ہم اس حقیقت سے آنکھیں نہیں چرا سکتے۔ یہ بات تم جتنی جلدی سمجھ لو تمھارے لیے اتنا ہی بہتر ہوگا، چچا نے بات ختم کی اور چچی مصلحتاً چپ ہوگئیں۔ چچی کی خاموشی نے چچا کو مطمئن کردیا کیونکہ وہ نوکری پیشہ آدمی تھے۔ چوبیس گھنٹے سامعہ کا خیال نہیں رکھ سکتے تھے۔ صبح نو بجے سے شام کے چھ بجے تک گھر پر چچی کا راج رہتا تھا اور وہ سامعہ سے من مانا سلوک کرنے کے لیے آزاد ہوتی تھیں۔ بچوں کا بچا کھچا کھانا دے کر وہ اس پر جو احسان کرتی تھیں اگر چچا دیکھ لیتے تو قیامت برپا کردیتے۔ رات کا کھانا چچا اسے اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔ پہننے کے لیے چچی اپنی لڑکیوں کی اترن دے دیتی تھیں۔ عید بقرعید پر نیا جوڑا بن جاتا تھا۔ اس معاملہ میں بے چارے چچا بھی مجبور تھے۔ ان کی بندھی ٹکی آمدنی اس سے زیادہ کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ قیامت تو اس دن آئی جب چچا نے سامعہ کا داخلہ اپنی لڑکیوں کے اسکول میں کرایا۔ سامعہ بہت ذہین تھی۔ والدین کی حادثاتی موت کی وجہ سے اس کی پڑھائی میں وقفہ ضرور آ گیا تھا لیکن لگن میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس لیے جب اس کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو وہ دلجمعی سے پڑھنے لگی۔ ہر ٹسٹ میں اس کے نمبر کلاس میں سب سے زیادہ آتے تھے اور سالانہ امتحان میں وہ ہمیشہ فرسٹ آتی تھی۔ اس کی ذہانت کی وجہ سے اسکول سے اسے وظیفہ ملتا تھا جس سے اس کی پڑھائی کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ چچی کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ ان کے بچے ٹیوٹر سے پڑھنے کے باوجود بس واجبی نمبروں سے پاس ہوں اور ان کے ٹکڑوں پر پلنے والی وظیفہ پائے۔ جبکہ ان کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ سامعہ گھر کے کاموں میں مصروف رہے اور اسے پڑھائی کا موقع نہ ملے۔ دراصل وہ اس سے وابستہ کوئی اچھی بات سننا پسند نہیں کرتی تھیں۔ کجا اس کا

فرسٹ آنا اور وظیفہ حاصل کرنا۔
سامعہ نے بی اے کرلیا تو کالج کی پرنسپل نے اسے مشورہ دیا کہ وہ بی ایڈ کرلے تو اسی کالج میں اس کی ملازمت پکی ہے۔ یہ بات سامعہ کی بھی سمجھ میں آگئی۔ بس سوال تعلیمی اخراجات کا تھا۔ سامعہ نے ہمت کی اور بی ایڈ میں داخلہ کا انتظام کسی طرح چچا نے کردیا۔ باقی اخراجات کے لیے اس نے چند ٹیوشن کرلیے اس طرح پڑھائی کا سلسلہ چلتا رہا۔ ٹیوشن پڑھنے والی لڑکیاں سب صاحب حیثیت تھیں اور کار سے آتی تھیں۔ کبھی کبھی کسی ضرورت کے تحت ان کی مائیں بھی آجاتی تھیں۔ رینا کی امی سامعہ کو بہت پسند کرتی تھیں اور اکثر اسے قیمتی گفٹ بھی دیتی تھیں۔ ایک دن ان کی پسند کا راز اس طرح کھلا کہ انھوں نے اپنے خالہ زاد بھائی کا پیغام دیا۔ چچا تو ان کی بات سن کر ہی دم بخود رہ گئے اور ایسا گھبرائے کہ منہ سے آواز نہیں نکلی۔ جب حواس ذرا بحال ہوئے تو معذرت خواہانہ لہجے میں بولے۔
'محترمہ آپ نے رشتہ بھیجا اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں لیکن ہمارا اور آپ کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ رشتہ برابر والوں میں ہی مناسب رہتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہم آپ کے احساس کے بوجھ تلے دب کر اپنا عندیہ ہی نہ دے سکیں یا ہماری کوئی رائے نہ ہو۔ اس لیے آپ ہمیں معاف کیجیے گا۔' دراصل میرا دل نہیں مانتا اس کے لیے۔'
'یہ بات زیادہ اہمیت نہیں رکھتی کہ مالی حیثیت میں ہماری آپ کی برابری نہیں ہے۔ سامعہ جیسی لڑکی کو پیسوں سے نہیں تولا جاسکتا۔ یہ تو انمول ہے۔ صورت سیرت میں یکتا، مہذب، نرم دل۔ ایسی کون سی خوبی ہے جو سامعہ میں نہیں ہے۔ ہمارے بھائی کے لیے یہ ایک پرفیکٹ لڑکی ہے۔ اس لیے آپ اس رشتے پر ضرور غور کریں۔' رینا کی ممی نے بڑی لجاجت سے کہا۔ چچا نے بھی سوچا کہ جب سامعہ کی قسمت جاگ رہی ہے اور اتنا اچھا رشتہ اس کے نصیب سے مل رہا ہے تو وہ انکار کرکے اس کی تقدیر کھوٹی کیوں کریں اس لیے رشتہ قبول کرلیا۔ امتحان کے بعد سامعہ کی شادی عرفان سے ہوگئی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ یہ ساری دھوم دھام عرفان کے گھر والوں کی طرف سے تھی۔ انھوں نے تو سامعہ کا جہیز بھی خود بنایا تھا کہ ہم چشموں میں ان کی یا سامعہ کی سبکی نہ ہو ورنہ بے چارے چچا کی کیا حیثیت تھی کہ اتنا قیمتی جہیز دیتے۔ جس بچی کے نوالوں پر بھی پابندی تھی وہ جب بیاہ کر سسرال گئی تو چچی نے پٹاس ڈال دی کہ ان کی بیٹیاں مناسب لڑکے کے انتظار میں کنواری رہ جائیں۔ جبکہ ان کی بیٹیاں بھی سامعہ سے بیس نہ سہی کم بھی نہیں تھیں۔ یہ لڑکی بچپن سے لے کر جوانی تک ان کے لیے چیلنج ثابت ہوئی تھی۔ نہ اس پر پیٹ کی مار کا اثر ہوا نہ ہی کسی سختی نے اسے متاثر کیا تھا۔ اس کا چاند دن بہ دن چڑھتا ہی رہا۔
عرفان کا گھر تھا کہ محل۔ کشادہ کمرے وہ بھی ایسے سجے سجائے کہ پانچ ستارہ ہوٹل کیا ہوگا گھر کی آرائش میں شوپیس جھاڑ فانوس، قالین، خوبصورت اور قیمتی فرنیچر گویا خوابوں کا جزیرہ۔ پوری کوٹھی میں ممی، ڈیڈی اور ہائی سوسائٹی کا کلچر چھایا ہوا تھا۔ کام کاج کے لیے ملازموں کی فوج۔ مثلاً انہیں حقیقتاً کر پانی پینا نہیں پڑتا تھا۔ پہننے کے لیے ایک سے ایک قیمتی برانڈیڈ، ملبوس اور زیور، بریک فاسٹ، لنچ و ڈنر کے وقت ڈائننگ ٹیبل ایسی سجی رہتی جیسے درجن بھر مہمانوں کی دعوت ہو۔
ڈیڈی کا لیدر کا بزنس تھا۔ ایم بی اے کے بعد عرفان بھی ان کے ساتھ بزنس میں لگ گیا تھا۔ ممی کا دن سو کر یا پارلر وغیرہ میں گزرتا تھا۔ شام کو ڈیڈی ممی کلب چلے جاتے تھے اور عرفان دوستوں میں ٹائم پاس کرنے نکل جاتا تھا۔ جانے کا تو معلوم تھا واپسی کا پتہ نہیں کہ کب آتا تھا یا نہیں آتا تھا۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ سامعہ کے لیے تو یہ ایک انوکھی دنیا تھی۔ یہاں میاں بیوی کا مطلب تھا نکاح نامہ پر طرفین کے دستخط ہونا۔ اس کے سوا اگر کوئی اور مطلب تھا تو اس کو معلوم نہیں تھا۔ چوبیس گھنٹوں میں بس دو چار جملوں کا تبادلہ ہی ازدواجی زندگی کا ثبوت تھا۔ ان کا تو کمرہ تک الگ تھا کہ چھوٹے لوگوں کی طرح میاں بیوی ہر وقت کی چپکا چپکی سے مبرا تھے۔ یہ سب تو غریبوں کی دلچسپیاں ہیں جس کے نتیجے میں ہر گھر میں آٹھ دس بچے کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے رہتے ہیں۔ جتنا بڑا گھر اسی حساب سے رکھ رکھاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ اونچے گھرانوں میں ایک یا حد سے حد ہے تو دو بچے نظر آتے ہیں۔ وہ بھی سنبھلے سنبھلائے ممتا تو خیر کیا چیز ہے۔ وقت بے وقت ممی ڈیڈی ہونے کا حق جتا دیا ورنہ بچے جانیں اور ان کی گورنس۔ آخر اتنی لمبی چوڑی تنخواہ اور رعایتیں کس لیے گورنس کو دی جاتی ہیں۔ ممی ڈیڈی کیا جانیں کہ چھوٹے بچوں کو کیسے رکھا جاتا ہے۔ ان کے پاس تو صاف ستھرے بابا اور بے بی لائے جاتے ہیں جنھیں دیکھ کر انھیں اطمینان ہوتا ہے کہ گورنس تنخواہ حلال کررہی ہے۔
سامعہ جس گھر سے آئی تھی وہاں ایک ایک نوالے پر جنگ ہوتی تھی۔ ماں باپ بچوں کی فکر میں ایک دوسرے کو نوچ کھاتے تھے۔ اگر چچی کئی دنوں نہ نہاتیں تو چچا کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا بلا غسل میت ہی کریں۔ پارلر، کلب، شاپنگ کس چڑیا کا نام ہے یہ انھیں کیا معلوم تھا۔ دن چڑھے کیا اگر گھر والی بچوں کے اسکول جانے سے ایک گھنٹہ پہلے نہ بیدار ہو تو بچوں کو کالی چائے، رس اور باسی روٹی تک نہ نصیب ہو۔ پھر سارا دن کام کام اور کام یہ نہیں کہ سوچنا پڑے کہ دن کیسے کاٹا جائے۔ عرفان اور اس کے ممی

ڈیڈی سامعہ کو گھر لا کر جیسے بھول گئے تھے کہ اس کی بھی کچھ خواہشات ہیں اور یہ کہ وہ محض شو پیس نہیں عرفان کی بیوی ہے اور وہ کوٹھی کے در و دیوار کی نہیں ان کی ذمہ داری ہے۔ وہ کب سوتی ہے، کب جاگتی ہے، سارا دن کیا کرتی ہے کسی اور کو نہ سہی عرفان کو تو مطلب ہونا چاہیے تھا۔ منہ دکھائی میں کنگن دینے کے علاوہ اس نے ایک پن تک نہیں دی تھی۔ وہ کب تیار ہو کر آفس جاتا ہے اسے یہ تک نہیں معلوم تھا۔ بریک فاسٹ کی میز پر وہ تنہا ہوتی تھی۔ ممی دیر میں سو کر اٹھتی تھیں۔ عرفان اور ڈیڈی کب ناشتہ کرتے تھے یہ اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ لنچ پر البتہ ممی ڈائننگ ٹیبل پر نظر آتی تھیں۔ یہی حال ڈنر کا تھا کیونکہ ان کا ڈنر کلب میں ہوتا تھا اور عرفان گھر پر موجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن اس کی شامت آئی تو اس نے عرفان سے پوچھ لیا۔

'عرفان! آپ روز شام کو کہاں جاتے ہیں؟ میں یہاں بالکل تنہا رہتی ہوں۔ جیسے عرفان لاعلم ہو۔

'کیوں؟ یہ جو درجن بھر ملازم ہیں وہ تمھیں نظر نہیں آتے جو تنہائی کا شکوہ کر رہی ہو؟۔ عرفان کا جواب تھا۔'

'میرا مطلب ہے کہ گھر کا کوئی فرد......' وہ منمنائی۔

'تمھارا مطلب ہے کہ ممی ڈیڈی اور میں گھر میں بیٹھ کر تمھاری تنہائی دور کریں، وہاٹ ربش۔؟ یہ اس گھر کے طور طریقے نہیں ہیں۔ البتہ تم جہاں سے آئی ہو وہاں یہ سب چلتا ہوگا۔' عرفان نے اسے اوقات یاد دلائی اور وہ یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ پھر اس شادی کا مطلب کیا تھا؟۔

اپنے جیسے لوگوں میں رشتہ کیوں نہ کیا۔ لیکن یہ سوال وہ اس سے نہ پوچھ سکی اس کی ساری ذہانت، فطانت کسی کام نہ آئی۔ اس دن کے بعد اس نے عرفان سے کوئی سوال نہیں کیا لیکن اس طرح گھٹ کر جینا مشکل تھا۔ زیورات سے بھرا ہوا لاکر، برانڈیڈ کپڑوں سے ابلتی ہوئی الماری، سجا سجایا کمرہ اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ ایسا گھر جہاں انسانوں کا ایک دوسرے سے رابطہ بس نام کو تھا۔ جہاں رشتوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ جہاں پیسہ ہی سب کچھ تھا اور وہ جس گھر سے آئی تھا وہاں پیسہ بہت کچھ تھا لیکن سب کچھ نہیں تھا۔ جہاں نوالے گنے جاتے تھے تو پیٹ بھرنے کی فکر بھی کی جاتی تھی۔ خصوصاً اس کے لیے بڑی مشکلات تھیں لیکن کم از کم اس کی گنتی زندہ لوگوں میں تھی۔ روبوٹ تو نہیں تھی وہ۔ احساس کرنے والے بچا اس کے پاس تھے۔ دکھ سکھ کا حساب کتاب بالکل صاف تھا۔ ظلم تھا تو مہربانی بھی تھی۔ زندگی اس طرح سپاٹ نہیں تھی۔ یہاں تو کسی کو اس کا احساس نہیں تھا۔ جیسے گھر میں شو پیس سجا کر اطمینان ہو جاتا ہے کہ اسے صحیح جگہ رکھ دیا ہے۔ خواہ برسوں وہ اسی جگہ پر رکھا رہے کیا فکر ہے۔ لیکن وہ کوئی شو پیس نہیں تھی زندہ انسان تھی اور زندہ انسان کی زندگی سے کچھ تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ اسے آج تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ عرفان نے شادی کیوں کی تھی؟ وہ اگر کسی کو پسند کرتا تھا تو ماں باپ یعنی ماڈرن ممی ڈیڈی کو بتا سکتا تھا۔ ایک غریب لڑکی پر احسان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ جو بس بیوی کے نام کا خانہ پُر کرنے کے کام آتی تھی۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بیٹا کنوارا ہے اور بیوی کی کیا حیثیت ہے یہ جاننے کی کسی کو ضرورت تھی نہ ہی فرصت۔ حد ہے کہ رینا کی امی نے بھی پلٹ کر اس کی خیر خبر نہیں لی تھی۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔

ایک دن اس کا جی بہت گھبرایا تو وہ گاڑی لے کر نکل گئی۔ ڈرائیور نے ایک 'مال' کے سامنے گاڑی روک دی بڑے گھروں کی خواتین عموماً 'مال' میں تفریح کرتی ہیں۔ وہ بھی ونڈو شاپنگ میں مصروف ہو گئی۔ دو تین بار شروع کے دنوں میں ممی اسے یہاں لائی تھیں۔ پیاس لگی تو وہ ملحقہ ریسٹورنٹ میں چلی گئی۔ ایک کونے کی میز پر بیٹھ کر کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔ چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی نظر عرفان پر پڑ گئی۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ ایک سانولی سی لڑکی شارٹ اسکرٹ اور سلیولیس ٹاپ میں ملبوس عرفان کے ساتھ تھی۔ وہ اسے پہچان گئی۔ اس کے آفس کی ٹائپسٹ انجیلا تھی۔ ریسپشن میں ان کا تعارف ہوا تھا۔ بلکہ عرفان نے بطور خاص انھیں ملوایا تھا لیکن یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ لنچ ٹائم میں ان کا ریسٹورنٹ میں موجود ہونا ایک الگ کہانی سنا رہا تھا۔ ان کی آپس میں بے تکلفی بلکہ بے تکلفی سے بڑھ کر شیفتگی ان کے ریلیشن شپ کی داستان سنا رہی تھی۔ ظاہر ہے اپنے اسٹیٹس کی پاسداری میں وہ اس سے شادی نہیں کر سکتے تھے۔ شادی کے لیے اس جیسی غریب گھر کی لڑکی ان کے خلاف زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ برابر والوں میں شادی کرنے کا مطلب تھا روزانہ محاذ آرائی۔ برابر کی ٹکر ہوتی تو کوئی لڑکی ایک دن میاں کی بے رخی برداشت نہیں کر سکتی تھی یا تو اپنا حق ایک دن وصول کرتی یا پھر میاں کو سوسائٹی کے سامنے جوابدہ ہونا پڑتا۔ اتنے اونچے اسٹیٹس والا عرفان یہ سب افورڈ نہیں کر سکتا تھا اور شاید ممی ڈیڈی بھی اس سے متفق تھے۔

اگلے دن اس محل کو چھوڑ چکی تھی اور پرنسپل کے سامنے کھڑی اس جاب کا تقاضہ کر رہی تھی جسے شاید اسی کا انتظار تھا۔

**Masroor Jahan**
Paras Apartment
3rd Floor, Durga Devi Marg
Husainabad, Lucknow-226003 (U.P)

ڈاکٹر گل جبین اختر انصاری

# خاموشی

گھر میں پہلا قدم رکھتے ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ کچھ ہوا ہے۔ گھر کی خاموشی بتا رہی تھی کہ کچھ تو ایسا ہوا ہے جو پریشان کن ہے، مجھے دیکھتے ہی گھر والوں کی جان میں جان آئی۔

رات کے دس بج رہے تھے، میری ٹرین کے پہنچنے کا صحیح وقت رات کے 8 بجے کا تھا، مگر کسی وجہ سے ریل گاڑی 2 گھنٹے دیر سے اسٹیشن پہنچی تھی، ابّو مجھے لینے اسٹیشن آئے تھے کیونکہ لکھنؤ کی فضا اچانک خراب ہو گئی تھی۔ جس وقت میں مغل سرائے سے لکھنؤ کے لیے نکلی تھی تب تک ایسی کوئی خبر نہیں آئی تھی مگر سلطان پور تک پہنچتے پہنچتے ابّو کا فون آ گیا تھا کہ لکھنؤ کے حالات اچانک بہت خراب ہو گئے ہیں اس لیے میں تب تک اسٹیشن سے باہر نہ نکلوں جب تک ابّو وہاں پہنچ نہ جائیں، ٹرین کا اس طرح دیر سے پہنچنا کسی بڑے شگن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں جب پلیٹ فارم پر اتری تو ابّو بے صبری سے میرا انتظار کر رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی میری طرف تیزی سے دوڑے۔ ان کی آنکھوں میں ایک انجانا خوف تھا، سلام دعا کے علاوہ ہم لوگوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ میرے پاس سامان کے نام پر ایک چھوٹا سا بیگ تھا جسے میں نے کاندھے پر ٹانگ لیا، پانی کی بوتل وہیں پھینک دی اور خاموش آنکھوں میں ایک ہی سوال لیے کہ ایسا کیا ہو گیا کہ لکھنؤ جیسا پرسکون شہر اس قدر رنگ ہو گیا ابّو کے پیچھے پیچھے چل دی اس وقت کچھ پوچھنا مناسب نہیں تھا ابّو کا اسکوٹر ان کے آفس کے سامنے کھڑا تھا۔ انھوں نے اسکوٹر نکالا میں پیچھے بیٹھ گئی۔ اسکوٹر اسٹارٹ ہوا اور ہم گھر کی طرف چل پڑے۔

ابھی رات کے دس ہی بجے تھے مگر ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اکتوبر کی سہانی شام جو عام طور پر ۱۱ بجے تک آباد رہتی ہے، لوگ سڑکوں پر ٹہلتے نظر آتے ہیں، جگہ جگہ پر دوستوں کی منڈلیاں گشت کرتی دکھائی دیتی ہیں جن میں سگریٹ کے دھویں، الجھنیں، سیاسی بحثیں، زندگی کی آپا دھاپی اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے، کچھ کھلی کچھ بند دکانیں نظر آتی ہیں مگر آج سے ۱۵ دن بعد دیوالی کے لیے سجی دکانوں پر تالے دیکھ کر دل دہل گیا۔ باقی دنوں میں دکانوں کے باہر مزدور اور رکشے والے جگہ جگہ چولہا جلائے کھانا پکاتے نظر آتے تھے، کچھ برتن دھوتے کچھ سبزی کاٹتے زندگی کی حرارت کا ثبوت دیتے تھے اور میں آٹو میں بیٹھی اپنے شہر کا یہ نظارہ دیکھ کر ذہن میں ایک شعر دہرانے لگتی تھی:

اے شہر لکھنؤ! تیری قسمت پہ رشک آتا ہے
قربان جاؤں تیری اداسی پر، کوئی تیرے لیے واپس آتا ہے

مگر آج وہ سب ندارد تھا۔ چھٹ پٹ دکانیں کھلی تھیں باقی سب بند، مزدور بھی جلدی کھا پکا کر کہیں کسی کونے میں آج کے حالات پر چرچا کر رہے ہوں گے یا نہیں۔ عام دنوں میں چار باغ اسٹیشن کے باہر سفیروں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا مگر آج وہاں سناٹے کی چادر باہیں پھیلائے تھی۔ آٹو اور رکشے والے بھی اکا دکا نظر آ رہے تھے وہ بھی شہر کے دوسری طرف جانے کے لیے جہاں گومتی نگر، عالم باغ اور اندرا نگر جیسے محلے آباد تھے۔ قیصر باغ قیصر باغ کی آواز لگانے والے ایک دو ہی تھے۔ مسافر ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ جنھیں لینے کوئی نہیں آیا تھا اور میری ہی طرح وہ بھی لکھنؤ کی اس سناٹے بھری رات کے خوف ناک ہو جانے سے انجان گھر سے نکل پڑے تھے، کوئی فون پر پریشان نظر آ رہا تھا تو کوئی پاپیادہ ہی چل پڑا تھا مگر سب

کے سب اس طرح خاموش تھے جیسے ان کے سرگوشی کرنے پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔

ابو بھی خاموشی کی چادر اوڑھے آہستہ آہستہ اپنا اسکوٹر چلا رہے تھے میں پیچھے بیٹھی لکھنؤ کی اس حالت پر افسوس کر رہی تھی اتنے میں اچانک اسکوٹر رکا، ہم لوگ ڈالی گنج پل پر پہنچ چکے تھے۔ ایک پولس والے نے ہاتھ دکھا کر ہمیں روکا اور ہماری طرف غور سے دیکھنے لگا، اس کی مشکوک نظروں نے مجھے اندر تک جھنجھوڑ دیا مانو اپنے ہی شہر میں ہم کوئی پردیسی ہوں۔ کچھ دیر کے بعد ایک دوسرا پولس والا ہماری پوچھ تاچھ کرنے حاضر ہوا، اس نے اپنی کڑکتی آواز میں ہم سے پوچھا،

" کہاں جا رہے ہو"؟

" کھدرا" ابو نے آہستہ سے جواب دیا، "اتنی رات کو کہاں سے آ رہے ہیں"؟ اس سوال پر میرا خون کھول گیا جی میں آیا کہ کہوں کہ اچھا اب آپ ہم لوگوں پر شک کریں گے مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ابو بول پڑے۔

"چار باغ اسٹیشن سے آ رہا ہوں جناب، اپنی بیٹی کو لینے گیا تھا"، ابو نے مزید وضاحت کی۔

"اپنا اپنا آئی کارڈ دکھاؤ" پیچھے سے پولس والا بولا، ابو نے اپنے بیگ سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر دکھایا اور میں نے اپنا، میرا کارڈ دیکھنے کے بعد اس نے ٹھٹھک کر مجھے دیکھا اور کچھ سوچتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا، "اچھا تو آپ بنارس سے آ رہی ہیں"

''جی''، میں نے سر ہلا دیا

''وہاں پڑھاتی ہیں، کیا پڑھاتی ہیں؟ اس نے پوچھا

''اردو'' میں نے ایک لفظ میں جواب دیا وہ اور کچھ پوچھتا اتنی دیر میں ایک دوسرا پولس والا عین سامنے آ کر بولا،

''آپ اس طرف سے نہیں جا سکتے، راستہ بند ہے، پتہ ہے نا۔''

بعد والا جملہ اس نے کچھ نرمی سے ادا کیا۔

''جی جناب، ہم دوسرے راستے سے چلے جائیں گے" یہ کہہ کر ابو نے اپنا اور میرا آئی کارڈ واپس لیا، اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور اسے پکے پل کے بجائے نشاط گنج والے راستے پر موڑ دیا، ادھر بھی ویسی ہی خاموشی تھی، کچھ کچھ دیر بعد کوئی آٹو یا کار پاس سے نکل جاتی اس کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی، پل پار کر کے ابو نے اسکوٹر ممتاز کالج کی طرف موڑنے کے بجائے سامنے والے راستے پر موڑ دیا جو راستہ آگے جا کر ڈالی گنج کراسنگ سے ملتا تھا، میں سمجھ گئی کہ وہ راستہ سنسان ہونے کی وجہ سے خطرناک ہو سکتا تھا۔

ڈالی گنج کراسنگ بند تھی، شاید سیتا پور سے آنے والی پسینجر ٹرین کا وقت ہو گیا تھا۔ کراسنگ کے اوپر جب سے فلائی اوور بنا تھا تب سے کراسنگ پر بھیڑ لگنا کم ہو گئی تھی، علی گنج کی طرف جانے والے لوگ اسی اوپری پل سے نکل جاتے تھے، مگر اتنے کم لوگ تو کبھی نہیں ہوتے تھے جتنے آج تھے۔ میری طرف بہ مشکل دو کار اور چند ایک بائک سوار نوجوان تھے، دوسری طرف البتہ ادھر سے کچھ زیادہ لوگ تھے، ٹرین آئی اور گزر گئی فاٹک کھلا، اسکوٹر پھر اسٹارٹ ہوا جو سیدھے گھر جا کر ہی رکا۔

محلے میں عام دنوں کے مقابلے میں سناٹا تھا، چند نوجوان دو دو تین تین کی ٹولی بنائے شاید آج کی واردات پر چرچا کر رہے تھے اور اپنی اپنی رائے ظاہر کر رہے تھے، ابو نے بغیر ایک منٹ گنوائے اسکوٹر گھر کے اندر کیا۔ گھر کی خاموش فضا میں سلام دعا کے چند لفظ گونجے اور پھر خاموشی، وہ ایک سوال مرے دل و دماغ میں بار بار گونج رہا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے مگر اس کا جواب دینے کے بجائے میں نے دیکھا کہ لوگ ٹیلیفون کی طرف نگاہ گڑائے بیٹھے ہیں، کسی کو بار بار فون لگایا جا رہا ہے مگر سامنے والا یا تو جان بوجھ کر جواب نہیں دے رہا ہے یا اس کا فون بند ہے یا پھر اس کے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہے کہ وہ فون کا جواب دینے کی حالت میں نہیں ہے۔ میں نے اپنا بیگ کرسی پر رکھا اور جیسے ہی پانی کا گلاس منھ سے لگایا اتنے میں یہ بات میرے کانوں تک پہنچ گئی کہ بڑا بھائی گھر سے غائب ہے اور صبح سے اب تک واپس نہیں آیا ہے، آخری بار فون پر بات ہوئے بھی کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ بات تشویش ناک تھی شہر کا ماحول تناؤ بھرا ہوا اور حالات مخالف ہوں تو گھر والوں کی پریشانی جائز ہے ایسے میں رات کے ۱۱ بجے تک گھر نا پہنچنا جب کہ سارا شہر سائیں سائیں کر رہا ہے دل بہت گھبرا رہا تھا۔ امی ابو کی طرف دیکھتیں اور ابو گھڑی کی طرف، سب لوگ بے بس اور مجبور تھے سب کے دلوں میں رہ رہ کر ایک ہی سوال آ رہا تھا کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو پھر ہم سب ایک دوسرے سے آنکھوں آنکھوں میں تسلی کے اشارے کر لیتے کہ نہیں نہیں کچھ نہیں ہوا ہے سب ٹھیک ہوگا۔ اللہ نہ کرے ایسا کچھ ہوا ہو، دل اس بات کو سوچنے پر بالکل آمادہ نہیں ہو رہا تھا مگر دماغ بار بار یہی بات سوچنے پر مجبور تھا۔

میرے سامنے کھانا آیا مگر میری بھوک مر چکی تھی دل و دماغ بھائی کی جانب لگا تھا، اس کے سارے دوست احباب کو فون لگا کر پتا کیا جا چکا تھا مگر وہ سب بھی ہماری ہی طرح انجان تھے۔ سفر کی تھکان سے میرے اوپر نیند کا غلبہ تھا میں صبح سے ہی گھر سے نکلی ہوئی تھی۔ یونیورسٹی میں ایک میٹنگ تھی جو بہت دیر سے ختم ہوئی اس کے بعد میں بھاگی بھاگی اسٹیشن آئی

تب تک میری ٹرین کا اعلان ہو چکا تھا تھوڑے سے وقفے کے بعد ٹرین آ گئی اور میں بیٹھ گئی اتنا وقت بھی نہیں ملا تھا کہ میں اسٹیشن کے کیفے ٹیریا سے کچھ کھانے کا سامان خرید سکوں۔ کمزوری اور تکان سے میری سوچنے سمجھنے کی طاقت بھی کچھ دیر کے لیے ختم سی ہو چکی تھی سارا گھر جاگ رہا تھا کوئی سونا بھی چاہے تو پریشانی میں نیند کسے آئی تھی۔ امی ابو ہم سب سے سونے کے لیے کئی بار کہہ چکے تھے لیکن ہمیں تو کسی اچھی خبر کے آنے کا انتظار تھا آخر پتہ بھی کوئی کہاں لگائے، یہ سوچتے سوچتے گھڑی نے رات کے 2 بجا دیے، وہ تو اپنے وقت سے چل رہی تھی، اچانک دروازے پر دستک ہوئی ہم سب اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے، تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل سے ابو نے دروازہ کھولا، سامنے بھائی نڈھال اور تھکا ہارا کھڑا نظر آیا۔ ابو نے لپک کر اسے اندر کر لیا اور فوراً دروازہ بند ہو گیا۔

سفید قمیص پر لال رنگ کے دھبے بتا رہے تھے کہ کسی کا خون بہا ہے، مقتول کا ہو یا قاتل کا، جہاں اس کے چہرے پر پریشانی کی لکیریں تھیں وہیں گھر پہنچ جانے کا سکون بھی تھا۔ بہن جلدی سے گلاس میں پانی لے آئی، امی کی خاموش نگاہوں میں اس وقت تسلی اور سکون کی جو پرچھائیاں نظر آئیں ان میں بلا کا سکون تھا، بیٹا سامنے آ گیا تھا، ابو کے ساتھ ہی ہم سب کے بہت سے سوال تھے مگر اب بھی سب خاموش تھے کسی انجانے ڈر کے خوف سے یا شاید خوشی سے امی نے بھائی کے زخموں کو صاف کر کے ان کی مرہم پٹی کی تب تک ہم سب وہیں ڈٹے رہے، سب نے مل کر کھانا کھایا اور بغیر ایک بھی سوال کا جواب پوچھے ابو نے ہم سب کو اپنے اپنے کمروں میں بھیج دیا۔

میں اپنے کمرے میں آ گئی جسے میں اپنی بہن کے ساتھ بانٹا کرتی تھی، رات اب زیادہ ہو چکی تھی۔ میری نیند غائب تھی ہو سکتا ہے کہ سب کو نیند آ گئی ہو۔ شہر کی پرسکون فضا میں نفرت کا یہ زہر کیسے گھل گیا، میں نے اپنی بہن کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں کہا، کوئی جواب نہ پا کر میں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا تو وہ سو چکی تھی، میں ماضی میں چلی گئی۔

اس شہر کو میں پچیس سال سے دیکھ رہی تھی حالانکہ پچھلے پانچ سالوں سے میری پوسٹنگ بنارس کے پاس مغل سرائے میں جب سے ہوئی تھی تب سے میں باہر تھی لیکن ہر پندرہ بیس دن میں خود کو تازہ کرنے اپنے شہر ضرور آ جاتی تھی یہاں آنا مجھے دماغی طور پر طوانائی دیتا تھا۔ ٹرین کا سفر تقریباً سات آٹھ گھنٹے کا ہوتا، گاڑی کبھی وقت پر پہنچتی کبھی گھنٹوں دیر سے مگر اپنے شہر سے کبھی ڈر نہیں لگا، کبھی کوئی اسٹیشن لینے آتا کبھی میں اکیلے ہی گھر پہنچ جاتی نہ کوئی پوچھنے والا پولس والا، نہ ڈرانے والا ماحول، نہ وہ خوف زدہ سنسان سڑکیں، پولس والے اپنی ڈیوٹی میں ڈٹے رہتے اور لکھنؤ اپنی رفتار میں، لیکن آج اتنے سالوں میں پہلی بار یہ رفتار سست نظر آئی تو دل کو گھبراہٹ ہوئی، ماضی اور حال کی اس ادھیڑ بن میں مجھے جھپکی آ گئی حالانکہ باہر سے ابو اور بھائی کی ہلکی ہلکی آوازیں میرے کانوں تک برابر آتی رہیں۔

امی نے آ کر جگایا تو 8 بج چکے تھے، پتا ہی نہیں چلا کب صبح ہو گئی۔ میں نے جلدی سے بستر سے نیچے چھلانگ لگائی، رات میں کپڑے تک نہیں بدلے تھے اتنا خیال ہی نہیں رہا تھا، کپڑے بدل کر میں برآمدے میں آ گئی۔ آتے ہی خبر ملی کہ شہر کے جن حصوں میں کرفیو نافض ہوا تھا اس میں میرا محلہ بھی آتا ہے اگر چہ گلیوں میں کرفیو کا اتنا اثر نظر نہیں آتا ہے اور نہ ہی

**"جی جناب، ہم دوسرے راستے سے چلے جائیں گے" یہ کہہ کر ابّو نے اپنا اور میرا آئی کارڈ واپس لیا، اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور اسے پکے پل کے بجائے نشاط گنج والے راستے پر موڑ دیا، ادھر بھی ویسی ہی خاموشی تھی، کچھ کچھ دیر بعد کوئی آٹو یا کار پاس سے نکل جاتی اس کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی، پل پار کر کے ابّو نے اسکوٹر ممتاز کالج کی طرف موڑنے کے بجائے سامنے والے راستے پر موڑ دیا جو راستہ آگے جا کر ڈالی گنج کراسنگ سے ملتا تھا، میں سمجھ گئی کہ وہ راستہ سنسان ہونے کی وجہ سے خطرناک ہو سکتا تھا۔ ڈالی گنج کراسنگ بند تھی، شاید سیتاپور سے آنے والی پیسینجر ٹرین کا وقت ہو گیا تھا۔ کراسنگ کے اوپر جب سے فلائی اوور بنا تھا تب سے کراسنگ پر بھیڑ لگنا کم ہو گئی تھی، علی گنج کی طرف جانے والے لوگ اسی اوپری پل سے نکل جاتے تھے، مگر اتنے کم لوگ تو کبھی نہیں ہوتے تھے جتنے آج تھے۔ میری طرف بہ مشکل دو کار اور چند ایک بائک سوار نوجوان تھے، دوسری طرف البتہ ادھر سے کچھ زیادہ لوگ تھے، ٹرین آئی او گزر گئی فاٹک کھلا، اسکوٹر پھر اسٹارٹ ہوا جو سیدھے گھر جا کر ہی رکا"**

اتنی گشت ہوتی ہے مگر آمد ورفت پر لگام تو لگ ہی جاتی ہے، ابھی تک دھوپ بہت ہلکی تھی بلکہ تھوڑی دیر پہلے کچھ بوندا باندی کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ گھر کے سبھی لوگ چائے ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے بس بھائی کو چھوڑ کر جسے کل چوٹ آئی تھی۔ چوٹ بھی کیا کہیں، برسوں پرانی دوستی کیا رنگ لائی تھی وہ کل بھائی کی قمیص پر لال رنگ کے دھبوں میں نظر آ چکی تھی۔ بس اسی کے بعد بھائی اور اس کے دوست اپنے اور پرائے کے جھگڑوں میں رات تک اس شہر کی خاک چھانتے رہے جس کی زمین اب ان کے لیے سخت ہو گئی تھی، وہ اب تک سو رہا تھا پتہ نہیں اس کا زخم کیسا تھا جو کل اس کی پیشانی پر لگا تھا، دوا کے نام پر جو ہلکی پھلکی دوا گھر پر رکھی تھی وہ دے دی گئی تھی۔

میرے سامنے چائے تھی اور ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں جہاں سارے چینل چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ دو مذہبی گروہ کی لڑائی میں اتنے ضائع ہو گئے تھے اور اتنے زخمی، اچھا تو سیاسی مسئلوں کو مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا لیکن کسی کو کیا پتہ تھا کہ کتنوں کے گھر لٹے اور کتنوں کی عصمت، کیا لکھنؤ کا حشر بھی ایودھیا جیسا ہونے والا تو نہیں ہے۔ میں نے دل میں سوچا زمینوں کی مالکانا لڑائی تو اب ہر جگہ شروع ہو چکی ہے۔ عام انسان اندر کی بات جانتا بھی نہیں اور جاننا چاہتا بھی نہیں، وہ بس اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سکون کی زندگی چاہتا ہے۔ کل پکے پل والا راستہ بھی اسی لیے بند کر دیا گیا تھا۔ میں نے دل میں سوچا، خبریں ایک سر میں ٹی وی والے سنائے چلے جا رہے تھے، میرا دل ان تصویروں کو دیکھ کر ہزار ٹکڑے ہو رہا تھا جو رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھیں۔ کس طرح معصوم لوگوں کی لاشوں پر کچھ لوگ اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے۔ مرنے والے کون تھے، جن کی لاشوں پر جیت کے جھنڈے گاڑے جا رہے تھے، وہ لاشیں کس کی تھیں جن کی سیڑھیاں بنا کر لوگ آگے ہی آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے مرنے والوں میں کیا وہ لوگ تھے جو ہمارے آقا بنے پھرتے ہیں ٹی وی پر جا کر بڑی بڑی بحثیں کرتے ہیں مگر نہیں مرنے والوں میں تو اس طبقے کے لوگ تھے جو دہاڑی پر کام کر کے اپنی زندگی کی گاڑی چلا رہے تھے ان کی عورتیں، بچے جو آج بارہ وفات کا جلوس دیکھنے جمع ہوئے تھے اور دوسری طرف وہ لوگ جو ہنومان مندر میں پوجا کے بعد پرساد لینے لائن میں کھڑے تھے، رکشے، ٹھیلے والے، زری کے کاریگر، کسے معلوم کون کہاں کھڑا تھا، کس کا بچہ پرساد کی لائن میں کھڑا ہے اور کون بارہ وفات کے جلوس میں، ان لوگوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ دونوں طرف کے ٹھیلا لگانے والے لوگوں کے درمیان تھوڑی سی جگہ کو لے کر ہوئی ایک چھوٹی سی تکرار اتنی بھیانک شکل اختیار کر لے گی، اتنی حساس جگہ اور انتظامیہ نداردیا دور تماشائی بن کر بیٹھا تھا۔

دن بھر ہم سب گھر میں ہی پڑے رہے جاتے بھی کہاں، کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ابھی کچھ دنوں پہلے ہی کی تو بات تھی لکھنؤ کی ساجھی وراست پر ایک پروگرام میں شامل ہونے میں یہاں آئی تھی جہاں گنگا جمنی تہذیب کا دلکش نظارہ دیکھنے کو ملا تھا۔ یہ وہی شہر ہے جہاں شاہ مینا کی مزار پر مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کا مجمع رہتا ہے، دیوالی کے دیے کیا ہندو کیا مسلمان دونوں کے گھروں میں برابر کی روشنی سے جگمگاتے ہیں۔ عید کیا اور ہولی کیا، امی کہا کرتی ہیں کہ اگر بھائی کے ہندو دوست نہ آئیں تو عید کی سیوئیں اور بکرعید کی بریانی ختم نہ ہو۔

شام ہوتے ہوتے کرفیو میں کچھ ڈھیل ملی تو میں بھائی کی دوا لینے نکل پڑی، ڈاکٹر کا دواخانہ میرے محلے سے لگے ہوئے اگلے محلے میں تھا جہاں ہندوؤں کی گھنی آبادی تھی اور جہاں میں بےخوف آتی جاتی تھی اور کیوں نہ آتی جاتی وہ میرا شہر تھا۔ مگر آج ڈر لگ رہا تھا، محلے میں قدم رکھتے ہی ایک انجانا خوف طاری ہو گیا جیسے میں اپنے ملک میں نہ ہو کر پرائے ملک میں جا رہی ہوں وہ بھی بغیر ویزا اور پاسپورٹ کے وہاں کے گھر اور ان میں رہنے والے لوگ مجھے پرائے اور اجنبی معلوم ہو رہے تھے ہر قدم پر دھڑکا لگا تھا کہ کہیں کوئی پیچھے سے روک نہ لے، مجھے یہاں سے بھگا نہ دے یا ایسا کچھ نہ ہو جائے جس کے بارے میں میں سوچ بھی نہیں سکتی، کیا حالات ایسے ہو گئے تھے یا یہ صرف میرا وہم تھا اور کیا ایسا ہی کچھ وہ لوگ بھی سوچتے ہوں گے جب وہ ہمارے محلے میں قدم رکھتے ہوں گے۔ یہ ڈر کی کیسی بساط بچھائی گئی تھی جس کی پہلی چال کل شام کو کھیلی گئی، میں نے دوا لی، کچھ پٹیاں اور مرہم خریدا، میرا خوف ڈاکٹر کی نظروں سے چھپ نہیں پایا اور وہی بےچینی مجھے بھی ڈاکٹر کی آنکھوں میں نظر آئی، مگر جو نفرت مجھے ان کے کمپاؤنڈر کی آنکھوں میں نظر آئی وہ اذیت ناک تھی، میرا کیا قصور تھا اس میں اور کیا کھویا تھا اس نے جس کا غصہ اس کی آنکھوں میں مجھے دکھائی دیا۔ میں نے پیسہ دیا اور ایک لفظ کہے بغیر تیز تیز قدموں سے لوٹ آئی۔

نیوز چینل میدانِ جنگ بنے ہوئے تھے، رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ اس سے تو اچھا ہوتا کہ یہ میڈیا ہوتی ہی نہیں، ہم لوگ گھروں میں سکون سے تو بیٹھے ہوتے، مگر جمہوری نظام میں میڈیا کی اتنی ہی اہمیت اور وہی ضرورت ہوتی ہے جو پارلیامانی سیٹ اپ میں مخالف پارٹیوں کی، یہ الگ بات ہے کہ وہ کون سا کردار نبھانے لگ گئیں ہیں۔ گھر میں تھوڑی بہت ان موضوعات پر بحث ہوئی مگر پھر خاموشی چھا گئی سب لوگ اپنے اپنے تئیں

گہرے مشاہدے میں لگے ہوئے تھے اور قیاس کی بنا پر حقیقت تک پہنچنے کی کوشش اندر ہی اندر جاری تھی۔ کم و بیش دونوں طرف سے ہلاک ہوئے لوگوں کی تعداد دس کے کچھ اوپر ہی پہنچ گئی تھی، حکومت کی طرف سے ان کے گھر والوں کو پانچ لاکھ اور زخمیوں کو پچیس ہزار روپے معاوضے کا اعلان کر دیا گیا تھا جوان کی زندگی کی قیمت تھی مگر صدمے میں اسپتال میں بھرتی وہ زخمی تھے جنھیں اپنے زندہ رہ جانے پر بہت افسوس ہو رہا تھا افسوس اس بات کا تھا کہ وہ بھی مر کیوں نہیں گئے، مرنے کے بعد کم سے کم کچھ رقم ان کے گھر والوں کو تو مل جاتی جوان کے زندہ رہنے پر انھیں نصیب نہیں ہوئی، جہاں زندگی مہنگی اور موت اس قدر سستی تھی مگر ان کم نصیبوں کو وہ بھی نصیب نہ ہوئی۔

کھانا کھا کر ہم سب اپنے اپنے بستروں میں چلے گئے۔ موسم میں ہلکی خنکی بڑھ گئی تھی، مگر میں نے کھڑکی کھلی رہنے دی، اس گھٹن بھری زندگی میں کوئی دریچہ تو ہو جہاں سے زندگی کو جینے کی توانائی مل سکے، میں سونے کی کوشش کرنے لگی مگر آنکھوں سے کل رات والا سناٹا اور چہار سو پھیلی گہری خاموشی ہٹ ہی نہیں رہی تھی اس پر پولس والوں کی وہ خونخوار نظریں، کتنا شک تھا ان نظروں میں اور کمپاؤنڈر کی وہ غصے سے بھری آنکھیں، کتنی نفرت تھی ان میں میرے لیے جیسے اس فساد کی جڑ میں ہی تھی۔ سب کچھ کتنا بدل گیا تھا ہر جگہ خوف و ہراس کا سایہ تھا بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں جا کر ختم ہوگی، کیا کسی کو اندازہ تھا کہ اس کی انتہا کیا ہوگی؟ وہ کون لوگ تھے جو تباہ ہوئے، بار بار انگلیوں پر گننے کے باوجود وہی لوگ آ رہے تھے جو مندر اور مسجد کے باہر چاٹ اور بچوں کے کھلونے کا ٹھیلہ لگائے تھے یا پرساد کے ان لڈوؤں کے لیے لائن میں لگے ہوئے تھے، جلوس دیکھنے والے عام لوگ ان کے بیوی بچے، ان کے علاوہ اور کوئی نام گننے میں آ ہی نہیں رہا تھا تو پھر وہ بندوق کی گولی کس کی تھی وہ لوہے کی راڈ کہاں سے آئی تھی جن سے کتنوں کے سر پھوٹے، تو کیا جلوس دیکھنے والے اور پرساد لینے آئے لوگ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، تو کیا اب حالات اس قدر خراب ہو گئے تھے، کم سے کم میڈیا تو یہی بتا رہا تھا۔

آدھی رات گزر چکی تھی سب لوگ سو چکے تھے، باہر ہلکی ہلکی سرسراہٹ سنائی دی، کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ آواز کانوں میں بار بار جا رہی تھی جو شاید نیند کی وجہ سے مجھے ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، آواز بڑھتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کھڑکی کو ہلا رہی ہے یا کوئی اور میں اٹھ کر بیٹھ تو گئی مگر کھڑکی تک جانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہوئی میں نے اپنی بہن کو ہلا کر اٹھایا وہ جلدی سے باقی لوگوں کو بلا لائی، آواز کچھ دیر کے لیے، ہم سب دم سادھے آواز کے پھر سے آنے کا انتظار کرنے لگے تھوڑی دیر بعد آواز پھر سے آنے لگی، باہر ہلکی روشنی تھی، مگر کھڑکی میں جالی لگی تھی جس سے اس کے پیچھے کچھ صاف نظر نہیں آ رہا تھا، ڈر سے ہم سب کی سانسیں اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رک گئیں تھیں، سب نے درود کا ورد شروع کر دیا تھا، اسی درمیان آواز بھی رکتی کبھی پھر آنے لگتی، اس بار ابّو نے ہمت کر کے کھڑکی کے پاس جا کر آہستہ سے پوچھا، " کون "؟ جواب میں کچھ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں جو سناٹے میں بے حد ڈراؤنی لگ رہی تھیں، کچھ دیر بعد جب کتوں نے بھونکنا کم کیا تو کھڑکی کے باہر سے پھر وہی آواز آنے لگی، ابّو نے پھر پوچھا ''کون''؟ پھر سے کچھ سرسراہٹ ہوئی اور کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا، ہم لوگوں کا ڈر عروج پر تھا۔ اتنے میں ایک آواز ابھری۔

''بچالو صاحب، دیا کرو''

ایک مریل سی آواز نے ہم سب کے ہوش فاختہ کر دیے تھے کون ہو سکتا ہے، کیا کوئی راہگیر جو پھنس گیا ہے یا کوئی مفسد، جو اپنے غول کے ساتھ ہم پر حملہ آور ہو، آواز پھر سے ابھری، "دیا کرو صاحب، بچہ مر جائے گا۔" دروازہ کھولنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی، اور نہ ہی حالات کا تقاضا، لیکن اگر واقعی کوئی مر رہا ہے تو تقاضا کچھ اور بھی کہتا ہے، لیکن کیا مانا جائے اس میں کوئی سازش تو تھی نہیں جس کا پتہ ہمیں نہ ہو، ہم سانس تھامے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑے تھے، جس کے یا تو اس طرف موت تھی یا اس طرف، کھولیں کہ رہنے دیں، دیا کرو دیا کرو کی آواز بیچ بیچ میں آتی جاتی رہتی اور کتوں کی گرّاہٹ بھی کہیں نہ کہیں سے آ ہی جاتی تھی۔ ابو اور بھائی نے ٹارچ کی روشنی میں بغل والے کمرے کی بالکونی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی جہاں اندھیرے میں ایک سایہ دوسرے سائے سے لپٹا نظر آیا، دیوار کے اس پار کتوں کا ایک گروہ کسی امید سے ادھر ہی تاک لگائے دیکھ رہا تھا، دونوں سائے شاید کتوں سے بھاگ کر دیوار لانگھ کر ادھر آ گئے تھے، حالانکہ دیوار کافی اونچی تھی، جسے لانگھتے وقت چوٹ آنا لازمی تھا، بہت سوچنے سمجھنے کے بعد دروازہ کھولنے پر سب کی رضامندی ہو گئی۔

دروازہ کھلا، سامنے خون سے تر ایک نوجوان ایک چھوٹے سے بچے کو جو تقریباً چار سے پانچ سال کا ہوگا سینے سے لگائے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا، نوجوان کی پوری قمیص خون سے تر تھی کسی نے پیچھے سے سر پر وار کیا تھا جس سے اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون کا پھوارہ بہہ نکلا تھا۔ چہرے پر چھائی مردنی بتا رہی تھی کہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گا، بچے کے پاؤں کے زخموں سے خون رس رہا تھا اس کی حالت بھی نازک تھی۔

آنکھیں بند کیے وہ نوجوان کے کاندھوں پر سر ٹکائے تھا یا درد کی شدت سے بے ہوش ہو گیا تھا، خون بہت بہہ چکا تھا آنکھوں میں پیلاہٹ آگئی تھی اگر فوراً علاج نہ کیا گیا تو ان دونوں کا بچنا ناممکن تھا سچ یہ تھا۔ دونوں اپنی آخری سانسیں گن رہے تھے۔

نوجوان بہت ڈرا ہوا اور بہت جلدی میں تھا ہم سب اسے گھیرے اس طرح آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی ایلین تھا، درد کی شدت سے اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی، ایک ایک لفظ نکالنے میں اسے بہت مشکل ہو رہی تھی، ابو نے اسے پانی دیا، پھر اس نے کچھ کھانے کو مانگا مگر تکلیف کی وجہ سے دو چار لقمے بھی اس کے گلے سے نیچے نہیں اترے، اس بیچ اس نے بتانا شروع کیا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا، کس طرح کل رات کے فساد میں کچھ لوگوں نے اس کا گھر لوٹ لیا اور بدلے میں اس نے بھی ایک گھر کے دو لوگوں کو مار ڈالا اور ان کے بچے کو لے کر بھاگ نکلا، اسی بیچ میں کسی نے اس پر حملہ کیا مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچے کو لے کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

"یہ بچہ کہاں سے آیا اور اس کی یہ حالت کس نے کی"؟ ابو نے پوچھا، "میں اس کے ماں باپ کے بارے میں نہیں جانتا، بس میں نے اپنا بدلہ لینے کے لیے جو سامنے ملا اسے مار دیا، یہ بچہ انھیں کے ساتھ تھا" اس نے اٹک اٹک کر جواب دیا، "یہ زخمی کیسے ہوا" میں نے کچھ غصے میں پوچھا، "کچھ لوگوں نے مجھ پر پیچھے سے حملہ کر کے زخمی کر دیا اور میں نے بھاگ کر ایک ٹوٹے مکان میں بچے کو لے جا کر چھپا دیا، جہاں کچھ آوارہ کتوں نے اس پر حملہ کر کے اسے زخمی کر دیا،" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا، "تو بچے کو تم نے مارا کیوں نہیں؟" اس بار بھائی نے حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا، "میں اسے مار دیتا مگر کتوں نے آدھی جان پہلے ہی لے لی، مرے ہوئے کو کیا مارتا، مجھے دیا آگئی تب سے میں اسے چھپائے ہوئے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ جہاں جاتا ہوں یا تو پولس والے مل جاتے ہیں یا یہ آوارہ کتے" اس نے اپنی مدھم پڑتی ہوئی سانسوں کے ساتھ اپنی بات پوری کی۔

''اسے یہاں کیوں لے کر آئے ہو اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا، " آپ اسے کچھ دن کے لیے رکھ لیجیے، اس کی جان بچ جائے گی، پھر میں اسے یہاں سے لے جاؤں گا'' اس نے اپنی مردہ آواز میں ایک بھیک مانگی ''اور تم اب کہاں جاؤ گے؟'' ابو نے سوال کیا، ''مجھے واپس جانا ہے ایک حساب پورا کرنے''

''کیسا حساب''؟ ابو نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا، "تمھاری جو حالت ہے اس میں تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہو گے، اور ہم لوگ ایسے حالات میں تم دونوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے، یہ پولس کیس ہے۔ یا تو خود کو پولس کے سپرد کر دو یا اس بچے کو لے کر کسی اسپتال جا کر دونوں کا علاج کراؤ، حساب تو تب لو گے نا جب زندہ بچو گے''

"نہیں صاحب مجھے فوراً جانا ہے، مجھ پر اور اس بچے پر رحم کرو اور اگر کوئی درد کی دوا ہو تو دے دو، میں پولس کے پاس نہیں جا سکتا اور نہ ہی ایسی حالت میں اسپتال، وہ ہزار سوال پوچھیں گے میں کیا جواب دوں گا اور ایسے میں بچہ مر جائے گا''۔ وہ بار بار بچے کی زندگی کی دہائی دے کر ہم لوگوں کو جذباتی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

"نہیں ہم اسے نہیں رکھ سکتے، ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے، نہ معلوم تمھاری کیا سازش ہو اس بچے کو یہاں چھوڑ کر جانے کی اور اس کا علاج ہم گھر پر کیسے کریں گے، یہ ناممکن ہے اور باہر کے حالات تو تم کو معلوم ہی ہیں اور اگر خدانخواستہ بچہ مر گیا تو، نہ بابا، ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے''۔ ابو نے دوٹوک جواب دے دیا وہ ہاتھ جوڑ کر بھیک مانگنے لگا اور ابو کے پیر پکڑنے کے لیے جیسے ہی نیچے جھکا چکرا کر زمیں پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ہم سب نے دوڑ کر ان دونوں کو سنبھالا اور بستر پر لے جا کر لٹا دیا، کسی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے، مصیبت نے ہمارا گھر اچھی طرح دیکھ لیا تھا، ایسے میں ہمیں مصیبت سے لڑنا زیادہ سہی لگا، ابو نے جلدی سے ان دونوں کے زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم پٹی کی، زخموں کے سوکھنے کی جو دوا میں بھائی کے لیے لائی تھی وہ دونوں کے منہ میں کسی طرح ڈالی۔ مگر بچے کی سہی دوا ہمارے پاس نہیں تھی اسے فوراً انجیکشن کی ضرورت تھی، ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے کسی طرح صبح تک کا انتظار کرنا تھا، اگر دونوں زندہ بچ گئے تو، اور اگر مر گئے تو؟ اس کا جواب ہم میں سے کسی کے پاس نہیں تھا، ان دونوں کی ہی طرح ہم سب بھی یہ سوچ سوچ کر ست اور بے جان سے ہو گئے تھے کہ اگر کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہو گا۔ ایک قاتل کو پناہ دینے کے جرم میں اور بچے کو اغوا کرنے کے جرم میں کیا سزا ملے گی اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ امی مسلہ اٹھا کر نماز پڑھنے لگیں۔ میں اور بہن بھی من ہی من جتنی آیتیں آتی تھیں سب دہرانے لگے بس ایک ہی دعا تھی کہ اے خدا ان دونوں کو بچا لے ورنہ ہم نہیں بچیں گے۔ دونوں زخمی باہر والے کمرے میں لٹائے گئے تھے، باقی سب لوگ اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے آدھی سے زیادہ رات ہماری اسی طرح گزری پھر کس وقت مجھے نیند آ گئی پتہ ہی نہیں چلا۔

اچانک کچھ تیز تیز آوازیں میرے کانوں میں پڑنے لگیں میں اس

وقت تک گہری نیند میں تھی، میں فوراً باہر والے کمرے میں بھاگی دیکھا تو وہ لڑکا بچے کو چھوڑ کر بھاگ چکا تھا پورے گھر میں کوئی نشان تک نہیں، ایک چٹھی البتہ چھوڑ گیا تھا جسے پڑھ کر ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین ہی کھسک گئی، خط کا مضمون کچھ یوں تھا:

’مجھے معاف کرنا صاحب! میں بچے کو چھوڑ کر بھاگ رہا ہوں میں نے جو کہانی سنائی وہ بھی جھوٹی تھی، میں ایک بچہ چوری کرنے والے گروہ کا سرغنہ ہوں، میرے ساتھیوں نے حالات کا فائدہ اٹھا کر میری بیوی کے ساتھ بدسلوکی کر کے اسے مار ڈالا اور جھوٹ بول کر میرے پڑوسی پر الزام ڈال دیا، میں نے غصہ میں اس گھر کے سارے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کا بچہ اٹھا لایا، مجھے اس کا حساب لینا ہے، میرے پاس کچھ بچے ہیں جنھیں رات ہونے سے پہلے بچانا ہے ورنہ میرے ساتھی ان کے ساتھ کیا کریں گے میں یہ بتا نہیں سکتا، آپ نیک لوگ ہیں بھگوان آپ لوگوں کا کچھ برا نہیں کرے گا۔‘

اتنا پڑھ کر ہم لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ اب تک جسے قاتل سمجھ رہے تھے وہ بچہ چور بھی تھا اور پتہ نہیں کیا کیا ہوگا جس کا ہمیں اندازہ بھی نہیں تھا، ہم اس قدر پھنس جائیں گے کسی نے سوچا بھی نہیں تھا، کس کا بچہ، کس نے چرایا، کہاں ملا، کس کو کیا جواب دیں گے، کہیں یہ ہمیں پھنسانے کی کوئی سازش تو نہیں رچ رہا تھا جس کی خبر ہمیں نہیں تھی، بچہ چرا کر ہم پر الزام ڈالنے کی کوئی سازش، جس میں اب تک ہم برے پھنس چکے تھے۔ وہ بچہ ابھی تک اسی مریل حالت میں تھا، سوچتے سوچتے دماغ سن ہو گیا تھا بس ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ خود کو بچانے کے لیے اس بچے کا زندہ رہنا بہت ضروری تھا جو اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ابو نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کر کے سب کچھ بتا دیا جو میرے دور کے رشتے دار بھی تھے، پہلے تو انھیں یقین ہی نہیں ہوا کہ ہم سے اتنی بڑی بلکہ خطرناک غلطی ہوئی کیسے، ایک انجان پر اتنا بھروسہ کیسے کیا وہ بھی ان حالات میں جب کہ حالات ہمارے ہی خلاف ہو گئے ہیں۔ مگر انھیں کیسے سمجھاتے کہ کن حالات میں ہم سے یہ غلطی سرزد ہوئی۔

اگلے دن ہمارے اور آس پاس کے محلوں میں دن کے وقت کرفیو میں ڈھیل دی گئی تھی، ہماری سب سے بڑی ذمہ داری اس بچے کے علاج کی تھی جو بستر مرگ پر تھا، اس لیے بغیر وقت گنوائے ابو ڈاکٹر کو گھر لے آئے کیوں کہ ایسے حالات میں بچے کو ڈسپنسری لے جانا ناممکن تھا، وہ اپنی پوری تیاری سے گھر آ گئے۔ بچے کی نبض دیکھتے ہی انھوں نے نا امیدی میں سر ہلاتے ہوئے کہا، امید بہت کم ہے، زہر پھیل چکا ہے بچہ نیلا پڑنے لگا ہے، یہ سن کر ہم لوگوں کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی، ’میں جو کر سکتا ہوں کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اگر کچھ گھنٹے میں ہوش نہیں آیا تو اسپتال لے جانا ہی ہوگا‘ اتنا کہہ کر انھوں نے اس کا علاج کرنا شروع کر دیا، امی کی نمازیں ہم سب کی تلاوتیں بدستور جاری تھیں، ڈاکٹر سے جو بن پڑا وہ کیا اور کچھ دوائیں دے کر چلے گئے، اب ہم لوگ اس بچے کی سانسوں میں اپنی زندگی تلاش کر رہے تھے۔

باہر کے حالات کے بارے میں جاننے کی اب ہماری کوئی خواہش نہیں تھی، کل سے کسی نے نہ ٹی وی دیکھا تھا نہ فون پر کوئی چرچا ہوئی تھی بس سبھی لوگ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس بچے کی نبض ٹٹولنے ضرور اس کے کمرے میں چلے جاتے جو میرے کمرے سے ہی لگا تھا، پورا دن گزر گیا پھر رات آ گئی، نہ جانے آج یہ رات کون سی مصیبت ہمارے لیے لے کر آنے والی تھی، بچے نے ابھی تک آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں، سانسیں بھی توازن میں نہیں آئی تھیں، اللہ یہ کیسے امتحان کی گھڑی ہے، ایسے ہی تیرے بندوں پر مصیبت کا پہاڑ آ گرا ہے ایسے میں تو نے ایک اور امتحان میں ڈال دیا ہے، ہم پر رحم کر اور اس مصیبت سے نکال لے، ہم سب یہ دعا مانگ مانگ کر تھک گئے تھے۔ نا بھوک پیاس، نا نیند نا سکون، سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں، کل کیا ہوگا، ہم پر کیا گزرنے والی ہے، اسی سوچ نے ہم سب کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ آدھی رات ہوتے ہوتے ہم سب لوگوں کو نیند آنے لگی تھی۔ میں بھی اپنے کمرے میں آ گئی، پوری رات پھر پورا دن اور پھر یہ رات ہم لوگ جس دماغی تکان سے گزرے تھے اس نے سب کو نڈھال کر دیا تھا اور آگے بھی ابھی کیا ہونے والا ہے یہ ڈر الگ سب کو لگ رہا تھا۔

رات تقریباً ایک بجے میں بچے کے کمرے میں گئی اس کو دیکھنے بلکہ یہ دیکھنے کہ زندگی کے کتنے آثار ہیں، خوش ہوئی یہ دیکھ کر کہ اب اس کی نبض کچھ نارمل ہو گئی تھی حالانکہ اس نے اب تک آنکھ نہیں کھولی تھی، گلوکوز کی بوتل ختم ہو گئی جو صبح سے ہی اس کو غذا پہنچا رہی تھی اور اسی کے سہارے دوا بھی، میں نے اسے بدلا اور کچھ دوا انجکشن کی مدد سے اس میں ڈالی اور کچھ دیر بیٹھ کر چلی آئی۔ تقریباً گھر کا ہر فرد تھوڑی تھوڑی دیر بعد جا کر اس کی نبض ٹٹول کر دیکھ آتا اور تسلی کر لیتا کہ آیا کچھ امید ابھی باقی ہے، دوا کام کر رہی تھی اور دعا بھی، دروازہ باہر سے بند کر کے میں اپنے کمرے میں چلی آئی اور خدا کا شکر ادا کر کے بستر میں لیٹ گئی، تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ میں کہیں خوابوں میں کھو گئی۔

میں نے خود کو ایسے میدان میں پایا جہاں میں بالکل تنہا تھی۔ یہ وہ

جگہ تھی جہاں آج سے بہت سال پہلے اپنوں نے اپنوں کا خون بہایا۔ دونوں طرف لڑنے والے بھائی تھے، ہزاروں لاکھوں کے خون سے آج بھی وہاں کی مٹی لال تھی۔ کیا جیتنے والا واقعی میں جیتا تھا یا ہارنے والا سچ میں ہارا، اس کے بعد میں نے خود کو ایک دریا کے کنارے پایا جس کا پانی گواہی دے رہا تھا ایک ایسی جنگ کا جہاں اپنوں نے اپنوں کو نہ صرف مارا بلکہ پیاسا رکھ کر مارا۔ وہاں بھی کون جیتا اور کون ہارا، کیا جیتنے والا سچ میں جیتا اور اگر وہ جیتا تو ہارا کون؟ میں وہیں دھیان لگا کر کھڑی ہو گئی تھوڑی دیر بعد بھگوان شیو میرے سامنے آئے اور میرے چہرے پر کھینچی فکر کی لکیروں کو دیکھ کر مسکرائے میں نے پوچھا 'کیوں؟ آخر تم سب دیکھ کر بھی خاموش کیوں ہو؟' ان کی مسکراہٹ میں ایک خاموشی تھی مجھ سے بولے، 'یہ چکر ہمیشہ ایسے ہی چلتا رہے گا، بھائی نے بھائی کا خون ہمیشہ بہایا ہے اور بہائے گا، یہ ستا کی لڑائی ہے۔ جس میں ایک طرف سچ ہے اور ایک طرف جھوٹ، سچ کو ہزاروں امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر اس کی جیت ہوتی ہے، قربانی دینی پڑتی ہے مگر جیت سچ کی ہی ہوگی، اتنا کہہ کر وہ چلے گئے اور میں انھیں دیکھتی رہ گئی، شیو ہمیشہ سے میرے inspiration رہے ہیں مگر آج انھوں نے مجھے الجھن میں ڈال دیا کہ یہ کیسا سچ ہے جو صرف خون بہا کر ہی جیتتا ہے، اس سے تو جھوٹ بہتر ہے جہاں امن تو رہتا ہے بھلے وہ بھی وقتی اور لمحاتی ہو۔ اچانک میرے آس پاس کچھ لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں، شور بڑھتا ہی گیا میں جتنا بھاگتی شور اتنا ہی بڑھتا، اچانک ایک جگہ میرے پیروں میں ایک رسی لپٹ گئی اور میں گر پڑی، اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

پتا نہیں کتنا وقت ہوا تھا اندھیرے میں گھڑی دیکھے بغیر میں نے پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔ زبان خشک ہو گئی تھی، گلے میں مانو کانٹے اگ آئے تھے، سانسیں بھی بے ترتیب ہو رہی تھیں، میں نے خود کو نارمل کیا اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگی مگر نیند غائب ہو چکی تھی، کچھ دیر یوں ہی پڑے رہنے کے بعد مجھے بچے کا خیال آیا۔ میں اس کے کمرے کی طرف لپکی۔ کمرے کا دروازہ باہر سے کھلا تھا، کوئی آیا ہوگا جو دروازہ بند کرنا بھول گیا، اندر کا حال دیکھ کر میں سناٹے میں آ گئی۔ بچہ غائب تھا، کاٹو تو خون نہیں، وہیں کھڑے کھڑے لو کو آواز دینی چاہی مگر حلق سے آواز ہی نہیں نکلی میں بھاگی اور سب کو بلا لائی، بدن کا سارا خون جم چکا تھا، پورا گھر تلاش کیا، مگر وہ کہیں نہیں ملا یہ کیا چل رہا تھا میرے گھر میں، جب چاہے کوئی آئے جب چاہے چلا جائے، مگر بچے کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ خود جا سکے تو پھر کون لے جا سکتا ہے۔ کہیں یہ اس بچہ چور سرغنہ کا کام تو نہیں؟ اب کیا ہوگا ہم سب ایک بار پھر خاموش جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو، سویرا ہونے میں ابھی کچھ گھنٹے باقی تھے اب تو پولس کے پاس جانا ضروری ہو گیا تھا حالانکہ امّی خوش تھیں کہ اچھا ہوا بچہ چلا گیا سر سے بلا ٹلی مگر ابو نے حالات کے تقاضے کو سمجھ کر پولس رپورٹ لکھوانے کا فیصلہ کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بلا ٹلی نہ ہو بلکہ اور بلاؤں کو اپنے ساتھ لے آئے۔

پچھلے دو دن ہم پر بہت گراں گزرے تھے اور اب اگلے کچھ گھنٹے کاٹنا ہم سب کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا، ابو نے ساری روداد ایک کاغذ پر قلم بند کر لی تھی سب کچھ سچ بتا دینے میں ہی ہماری بھلائی تھی۔ سورج نکل آیا تھا، امّی نے چائے چڑھا دی اور میں بالکونی میں رکھے پودوں کو پانی دینے چلی گئی، باہر محلے والے نماز پڑھ کر واپس آ رہے تھے، لوگوں کی صبح کی سیر بھی کچھ دن سے بند ہو گئی تھی، زیادہ سے زیادہ دو چار منٹ لوگ رک کر خیریت پوچھ لیتے اور پھر چل دیتے، میں نظریں جھکائے اپنے پیڑوں کی طرف دیکھتی رہی۔ کہیں کہیں کچھ خون کے دھبے نظر آ رہے تھے میں نے جلدی جلدی ان کو صاف کرنا شروع کر دیا دھبے دو دن پرانے تھے اس لیے سوکھ چکے تھے۔ میں نے جلدی جلدی وہ پتے توڑ کر کوڑے میں پھینک دیے جن پر خون جما تھا، اتنے میں اخبار والا آ گیا میں نے آج تک اسے نہیں دیکھا تھا، ایک تو میں یہاں رہتی بھی نہیں تھی اور جب ہوتی بھی تو اتنی صبح اٹھنے کا سوال ہی نہیں تھا جتنی صبح وہ اخبار لے کر آ جاتا تھا میں نے مسکرا کر اسے دیکھا، وہ بھی جواب میں مسکرا دیا۔ اس کے ماتھے کے ٹیکے سے میں اس کا مذہب سمجھ گئی تھی۔ میں نے اسے اشارے سے نمسکار کیا اور اخبار لے کر اندر آ گئی۔ اخبار کی ہیڈ لائنس کسی طوفان سے کم نہیں تھی جس کا عنوان کچھ یوں تھا:

'بچے چرانے والا گینگ پولس مڈبھیڑ میں مارا گیا پانچ بچے برآمد' لاشوں میں ایک لاش اس کی بھی تھی جو دو دن سے ہماری زندگی پر سائے کی طرح منڈلا رہا تھا۔ ساتھ میں کچھ اور لاشیں دیکھ کر کراہیت پیدا ہو گئی مگر ان برآمد بچوں میں اس بچے کو بھی سلامت دیکھ کر ہم سب نے راحت کی سانس لی اور دل ہی دل میں سوچا کہ کبھی کبھی یہ میڈیا بھی ضروری ہوتا ہے اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی مگر اس بار خاموشی سکون دہ تھی۔

**Dr. Guljabeen Akhtar Ansari**
Assistant Professor
Dept. Of Urdu
Lal Bahadur Shastri PG College,
Mughalsarai-232101(U.P)

# غزلیں

مسعودہ حیات

دل و نگاہ میں اک روشنی سی لگتی ہے
تمھاری یاد سے وابستگی سی لگتی ہے

یہ کیا ستم ہے مہکتی ہوئی بہاروں میں
ہر ایک چہرے پہ پژمردگی سی لگتی ہے

یہ کس کے ہاتھ میں آیا ہے دور پیمانہ
لبوں پہ اپنے بڑی تشنگی سی لگتی ہے

ہم اپنے گھر میں بھی ہیں اب مسافروں کی طرح
ہر ایک چیز یہاں اجنبی سی لگتی ہے

ہر ایک سانس پہ پہرہ ہے ناخداؤں کا
یہ زندگی بھی کوئی زندگی سی لگتی ہے

ہزار شوق نمایاں تھے جس نظر سے بھی
وہی نگاہ بڑی اجنبی سی لگتی ہے

حیات کون سی اب راہ اختیار کریں
ہر ایک راہ بڑی اجنبی سی لگتی ہے

ثمینہ قمر

غم ہو کہ خوشی ہم پہ اثر کچھ بھی نہ ہوگا
پہلو میں نہ ہو دل تو خطر کچھ بھی نہ ہوگا

احساس، تمنائیں، تڑپ ، آرزو ، خواہش
ان میں سے کسی کا بھی اثر کچھ بھی نہ ہوگا

دیکھا کرے وہ پیار کی نظروں سے ہمیں کیا
دل پر اثر تیر نظر کچھ بھی نہ ہوگا

کیوں مفت میں بدنام کیے جاتا ہے کوئی
رسوائیوں کا ہم پہ اثر کچھ بھی نہ ہوگا

آئے گا بھلا کیا وہ عیادت کو کسی کی
سن کر جسے مرنے کی خبر کچھ بھی نہ ہوگا

ایک ایسے مکاں کا میری آنکھوں میں ہے نقشہ
جس میں کوئی دیوار نہ در کچھ بھی نہ ہوگا

جو دل میں ہے وہ بات کہو اپنی زباں سے
خاموش رہوگی تو قمر کچھ بھی نہ ہوگا

**Sameena Qamar**
20, Paul Street, Babu Bhai Burqe Wale
Near Marhaba Corner Jinsi Jehangirabad
Bhopal-462008(Madhya Pradesh)

حمیرا خاتون

# وجودِ من۔۔!

عشق دیرینہ کی
بے سود تھکن
منجمد ہو گئی۔۔۔
میرے ناتواں وجود میں
جو شکست خوردہ، خوں گشتہ آلام کو
لحہ لحہ توڑ کر
سوکھے پتوں کی مانند
صحرا صحرا بے کراں
اڑائے پھر رہی ہے
یہاں سے وہاں!

یہ ناتواں وجود۔۔۔
زود کوب ہوتا ہوا
نفرتوں کے تھپیڑوں سے
حقیقتوں اور فسانوں سے
ان گنت سوالوں میں
ڈھونڈ رہا ہے
پھر سے اسرار و رموز
بے وفا زندگی کے

ہاں مگر۔۔!
حوصلہ نہیں ہارا
تھک کر گرا نہیں ہے
فقط ٹوٹا ہے اندر سے
بکھرا نہیں ہے!!
دشواریاں، تنہائیاں
شکستہ دل کی غمخواریاں
غالب ہیں راہِ زیست میں
پیہم، مسلسل ہر سانس پر
مگر پھر بھی جی رہا ہے
یہ ناتواں وجود۔۔
مَرا نہیں ہے!!

**Humera Khatoon**
1033-Haveli Bakhtawar Khan
Matia Mahal
Jama Masjid, Delhi-110006

# لذیذ پکوان

## سیخ کباب

**اجزا:** بکرے کا قیمہ 1 کلو، انڈے 2 عدد، پیاز 1 پاؤ، ہری مرچ 6 عدد، ہرا دھنیا آدھی گٹھی، پپیتے کا پیسٹ 1 چائے کا چمچہ، پسی لال مرچ 2 چائے کے چمچے، نمک آدھا چائے کا چمچہ، پسا گرم مصالحہ 1 چائے کا چمچہ، پسی جائفل آدھا چائے کا چمچہ، پسی جاوتری آدھی چائے کا چمچہ، ادرک لہسن کا پیسٹ 2 چائے کے چمچے، تیل حسب ضرورت

**ترکیب:** چوپر میں 1 کلو قیمہ، 1 پاؤ پیاز، 6 عدد ہری مرچ اور آدھی گٹھی ہرا دھنیا ڈال کر باریک پیس لیں۔ اب اس میں 2 چائے کے چمچے ادرک لہسن کا پیسٹ، 1 چائے کا چمچہ پپیتے کا پیسٹ، 2 چائے کے چمچے پسی لال مرچ، آدھا چائے کا چمچہ نمک، 1 چائے کا چمچہ پسا گرم مصالحہ، آدھی چائے کا چمچہ پسی جائفل آدھی چائے کا چمچہ پسی جاوتری اور 2 عدد انڈے مکس کر کے سیخوں پر لگائیں۔ پھر ان کو گرم تیل میں فرائی کر لیں۔

## سکندری پلاؤ

**اجزا:** بکرے کا گوشت آدھ کلو، اُبلے کالے چنے آدھ پاؤ، چاول 300 گرام، پیاز دو عدد، ادرک لہسن کا پیسٹ دو کھانے کے چمچے، گاجر ایک عدد، دودھ ایک کپ، بادام 50 گرام، پستے 50 گرام، کاجو 50 گرام، تیز پتے دو عدد، دارچینی ایک ٹکڑا، چھوٹی الائچی چار عدد، ثابت زیرہ ایک چائے کا چمچہ، ثابت لال مرچ چار سے پانچ عدد، نمک حسب ذائقہ، گھی آدھ پاؤ، پانی ڈیڑھ گلاس

**ترکیب:** پہلے پین میں آدھا پاؤ گھی، باریک کٹی دو عدد پیاز، آدھا کلو گوشت اور دو کھانے کے چمچے ادرک لہسن کا پیسٹ شامل کر کے بھون لیں۔

جب گوشت کا رنگ تبدیل ہوجائے اور پیاز اچھی طرح سے نرم ہوجائیں تو اس میں دو عدد تیز پتے، ایک ٹکڑا دارچینی، چار عدد چھوٹی الائچی، ایک چائے کا چمچہ ثابت زیرہ، لال مرچ اور تھوڑا سا پانی ڈال کر ڈھک کر گوشت گلنے کے لیے چھوڑ دیں۔

اس دوران ایک عدد گاجر کے چھوٹے کیوبز کاٹ کر تھوڑے سے گرم پانی میں جوش دے لیں ۔ 25 سے 30 منٹ بعد جب گوشت گل جائے تو اس میں بادام، پستے، جو، اُبلے چنے اور چاول شامل کریں۔

اب ہلکی آنچ پر چاولوں کو اتنا پکائیں کہ چاول پھول کر اوپری سطح پر آنے لگیں، پھر حسب ذائقہ نمک شامل کر کے مکس کریں اور 8 سے 10 منٹ کا دم دے دیں۔ تیار ہونے پر گرم گرم سرو کریں۔

## افغانی قورمہ

**اجزا:** بکرے کا اُبلا گوشت آدھا کلو، کٹی پیاز 2 عدد، ادرک لہسن 1 کھانے کا چمچہ، نمک 1 چائے کا چمچہ، پسی لال مرچ 1 چائے کا چمچہ، ثابت لال مرچ 8 عدد، لیموں کا رس 1 کھانے کا چمچہ، دہی 1 کپ، کیوڑا 1 چائے کا چمچہ، گرم مصالحہ آدھا چائے کا چمچہ، تیل چار چمچہ

**ترکیب:** پہلے آدھا کلو بکرے کا گوشت آدھے گھنٹے کے لیے اُبال لیں۔ اب چار چمچ تیل گرم کر کے اس میں 2 عدد کٹی پیاز کو لائٹ گولڈن کریں۔ پھر اس میں 1 کھانے کا چمچہ ادرک لہسن کا پیسٹ، 1 چائے کا چمچہ نمک اور 1 چائے کا چمچہ پسی لال مرچ شامل کر کے اچھی طرح فرائی کر لیں۔ اس کے بعد گوشت کو بچی ہوئی یخنی، 8 عدد ثابت لال مرچ اور 1 کپ دہی کے ساتھ شامل کر کے 10 منٹ پکائیں اور مسلسل چمچہ چلاتے رہیں۔ اب اسے ہلکی آنچ پر مزید 10 منٹ کے لیے دم پر رکھیں۔

آخر میں 1 کھانے کا چمچہ لیموں کا رس، 1 چائے کا چمچہ کیوڑا اور آدھا چائے کا چمچہ گرم مصالحہ ڈال کر نکال لیں۔

## مٹن کنہ

**اجزا:** بکرے کا ہڈی والا گوشت آدھا کلو، تیل دو کپ، لہسن کا پیسٹ 3 کھانے کے چمچے، ادرک کا پیسٹ 3 کھانے کے چمچے، لال مرچ 4 چائے کے چمچے، نمک 1 چائے کا چمچہ، دہی 4 کھانے کے چمچے، زیرہ 2 کھانے کے چمچے، سونف 2 کھانے کے چمچے، کالی مرچ 2 کھانے کے چمچے، سونٹھ 2 کھانے کے چمچے، کالی الائچی 2 کھانے کے چمچے، لونگ 1 کھانے کا چمچہ، جائفل 1 کھانے کا چمچہ، جاوتری 1 کھانے کا چمچہ، پیاز باریک سلائس 1 عدد، میدہ 6 کھانے کے چمچے،

### گارنش کے لیے

کٹی ہری مرچ حسب ضرورت، کٹی ادرک حسب ضرورت، لیموں کے سلائس حسب ضرورت

**ترکیب:** ایک چوتھائی کپ تیل گرم کر کے آدھا کلو بکرے کا ہڈی والا گوشت، 3 کھانے کے چمچے ادرک کا پیسٹ، 3 کھانے کے چمچے لہسن کا پیسٹ 4 چائے کے چمچے لال مرچ اور 1 چائے کا چمچہ نمک ڈال کر 5 سے 8 منٹ پکا کر گوشت براؤن کریں۔ پھر 4 کھانے کے چمچے دہی ڈال کر بھونیں یہاں تک کہ ساری نمی خشک ہو جائے۔ اس دوران چمچہ چلاتے رہیں۔ اب پانی ڈال کر درمیانی آنچ پر ایک گھنٹہ یا گوشت گلنے تک پکائیں۔ گرائنڈر میں 2 کھانے کے چمچے زیرہ، 2 کھانے کے چمچے سونف، 2 کھانے کے چمچے کالی مرچ، 2 کھانے کے چمچے سونٹھ 2 کھانے کے چمچے کالی الائچی، 1 کھانے کا چمچہ لونگ، 1 کھانے کا چمچہ جائفل اور 1 کھانے کا چمچ جاوتری باریک پیس کر چھان لیں۔

اب 3 سے 4 کھانے کے چمچے پسا مصالحہ ڈال کر ڈھکن لگائیں اور ہلکی آنچ پر گوشت پکنے دیں۔ 2 کپ پانی میں 6 کھانے کے چمچے میدہ گھول لیں اور گوشت میں ڈال کر احتیاط سے ملائیں تاکہ گوشت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں نہ آئے۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے باریک سلائس میں کٹی 1 عدد پیاز بھون کر گولڈن کریں پھر تیل سے نکال کر گوشت میں ڈال کر احتیاط سے ملائیں۔ مٹن کُنہ کٹی ہری مرچ، کٹی ادرک اور کٹے لیموں سے گارنش کر کے نان کے ساتھ سرو کریں۔

□□□

(بحوالہ: www.kfoods.com)

# یہ کھائیں، دورانِ خون بہتر بنائیں

خون کا ہونا زندگی کی علامت ہے۔ ہماری رگوں میں دوڑتا خون ہی ہمارے چلنے، پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے اور ہماری تمام تر توانائیوں کا باعث ہے۔خون کی موجودگی کے بعد خون کی درُست روانی بھی اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں ہم آپ کو کچھ ایسی غذائیں بتانے جارہے ہیں جو خون کی روانی کو بہتر بناتی ہیں، جس کے باعث آپ اپنے اندر توانائی محسوس کرتے ہیں اور بہت سی بیماریوں کا شکار ہونے سے بھی بچ جاتے ہیں۔

**ہلدی:**

ہلدی زیادہ تر کھانا پکانے میں استعمال کی جاتی ہے لیکن اس کو پکانے کے علاوہ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ انسانی جسم کے اندر خون کو بہتر طریقے سے سپلائی کرنے کے لیے بہت مددگار ہے۔استعمال کرنے کے لیے ایک چائے کا چمچ ہلدی پاؤڈر اور ذرا سا شہد لے کر ان دونوں کو نیم گرم دودھ میں ملا کر پی لیں۔دن میں دو مرتبہ یہ نسخہ استعمال کریں۔اس کے علاوہ کھانے پکانے میں بھی باقاعدگی سے استعمال کریں۔

**لال مرچ کا پاؤڈر:**

لال مرچ کے اندر capsicin نامی ایک جزو پایا جاتا ہے جو جسم میں خون کی روانی بہتر بناتا ہے۔ یہ تھکاوٹ، سر درد اور دیگر بیماریاں جو خون کی نامناسب روانی کے باعث پیدا ہوتی ہیں ان سب کو ختم کرنے کے لیے بہت مددگار ہے۔اسے استعمال کرنے کے لیے آدھا چائے کا چمچ

سرخ مرچ پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ سیب کا سرکہ اور ایک کھانے کا چمچ بلیک سٹریپ مولاسز لے کر ایک کپ پانی میں ملا لیں اور دن میں دو مرتبہ استعمال کریں۔ حاملہ خواتین یا دودھ پیتے بچوں والی خواتین لال مرچ کا استعمال نہ کریں۔

**ناریل کا تیل:**

ناریل کے ویسے ہی بہت سے فوائد ہیں اور مزید یہ کہ ناریل کے تیل کا استعمال بھی جسم میں خون کی روانی کو بہتر کرنے کے لیے بہت مددگار ہے۔ اس میں پائے جانے والے اجزاء خون کی سپلائی کو جسم کے تمام حصوں تک بہتر انداز میں ممکن بناتے ہیں۔ استعمال کرنے کے لیے روزانہ تین کھانے کے چمچ ناریل کا تیل پئیں اور اپنے دورانِ خون کو دنوں میں بہتر بنائیں۔

**سبز چائے:**

بہت سے لوگ جسم سے چربی گھٹانے، چاق و چوبند رہنے یا بہت سے دوسرے مقاصد کے لیے بھی سبز چائے کا استعمال تقریباً روزانہ کرتے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کئی فوائد ہیں۔ آج آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ سبز چائے کا استعمال دورانِ خون کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ یہ خون کی شریانوں کو کھولتا ہے جس کے باعث خون کا دورانیہ بہتر ہوتا ہے۔ دن میں دو سے تین مرتبہ سبز چائے لازمی پئیں۔

**لہسن:**

لہسن تو ہر گھر میں پایا ہی جاتا ہے لیکن اسے ہر کوئی استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم جانتے ہی نہیں

کہ لہسن کتنی بیماریوں سے نجات کے لیے مفید ہے۔ یہ بلڈ پریشر کو کم کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خون کے دورانیے کو بہتر کرنے میں بھی بہت مددگار ہے۔ استعمال کے لیے لہسن کی دو پوتھیاں روزانہ خالی پیٹ پانی سے نگل لیں۔

(بحوالہ: www.mag.dunya.com.pk)

□□□

ڈاکٹر احسان رؤف

# چہرہ کو بارونق بنانے کے آسان نسخے

آج کل چہرہ کی رنگت نکھارنے ،رنگ صاف کرنے ،موسمی اثرات سے محفوظ رکھنے،اسے چمکدار اور بارونق بنانے کے لیے نباتی اور کیمیکل ہر طرح کی کریم ،لوشن کا بازار بہت گرم ہے۔تجارتی انداز کے اشتہارات سے ایسا لگتا ہے کہ یہ دوائیں نہ ہوں بلکہ کوئی جادو، ٹونا اور چمتکاری کوئی چیز ہو جس کے لگاتے ہی بس چہرہ کی تکان اور پسینہ کی وجہ سے چکناہٹ غائب، اور تو اور صرف 14 دنوں میں چہرہ کا رنگ سیاہ سے گیہواں بن جاتا ہے اس میں خاص طور سے کیمیکل سے تیار کریم نہ صرف چہرہ کی اصل رونق چھین لیتی ہے بلکہ بہت سے بیچارے ایسے دھبوں یا دانوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کا علاج آسان نہیں ہوتا ہے۔

نباتی (ہربل) دواؤں میں تو براہ راست ایسا نہیں ہوتا لیکن ان نسخوں کی تیاری میں جن تیز اثر کیمیکل کو شامل کیا جاتا ہے ان کے نقصان سے تو بہر حال محفوظ نہیں رہا جا سکتا۔

ذیل میں ایسے نسخے لکھے جا رہے ہیں جن کا استعمال بھی آسان ہے اور ان سے کوئی نقصان بھی نہیں ہوتا۔

## پپیتہ سے بنا ہوا ماسک

اس کے لیے پکے پپیتہ کے چند ٹکڑے لے لیں اور انھیں خوب اچھی طرح پیس کر لیپ تیار کریں۔ پھر 15 منٹ تک پورے چہرہ پر لگائے اس کے بعد گرم پانی سے دھولیں۔

## عرق گلاب سے بنا ماسک

ایک چائے کے چمچ عرق گلاب میں ایک چمچ دہی اور شہد ملائیں پھر اس میں پکے کیلے کی ٹکڑے ڈال کر لیپ تیار کریں۔ پھر 3 منٹ تک چہرہ پر لگائیں۔ لیپ ٹھنڈے پانے سے دھولیں۔

## آب ناریل سے تیار ماسک

ناریل کے گولے کو توڑ کر اس کا پانی نکالیں پھر اسے چہرہ پر 20 منٹ تک لگائیں رکھیں بعد میں ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

**عرق لیموں سے بنا لوشن**

ایک چمچ عرق لیموں کو آدھے چمچ دودھ کی بالائی اور ایک چمچ انڈے کی سفیدی ملا کر لوشن تیار کریں 15 منٹ تک چہرہ پر لگائیں رکھیں پھر ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

**ان نسخوں کے علاوہ چہرہ کی جھائیں کے لیے درج ذیل نسخے مفید ہیں**

خربوزہ کے بیج، جوار کی بھوسی اور کتیرا ہر ایک 7 گرام، چھلے ہوئے جو 14 گرام کوٹ کر پانی میں بھگودیں اور رات بھر لگائیں صبح دھولیں۔

اگر چہرہ کی رنگت سیاہ ہوگئی ہو تو مولی کے بیج 25 گرام، کندش 7 گرام، اور کوٹھ 7 گرام کو سرکہ میں پیس کر لیپ تیار کریں۔ 15 منٹ تک لگائیں رکھیں پھر دھوڈالیں۔

آرد نخود (چنے کا آٹا)، آرد باقلہ، آرد کرسنہ، آرد عدس (مسور کا آٹا) کا ضماد عرق گلاب میں ملا کر چہرہ پر لگائیں۔ جھائیں سے تحفظ کے طور پر محافظ شعائیں شمسی (Sun Screen) کا بھی استعمال کریں۔

**یبوست جلد (Dry Skin) میں مفید ادویہ**

اندرونی طور پر روغن بادام شیریں 5 قطرے یا روغن کا ہو 5

قطرے یا روغن زیتون 5 قطرے ایک کپ دودھ میں ملا کر استعمال کریں۔

بیرونی طور پر مغز گھیکوار (Aloe vera)، گلسرین، پٹرولیم جیلی استعمال کریں۔ جلد کو بار بار عرق گلاب وغیرہ سے تر رکھنا بھی یبوست جلد میں مفید ہے۔

**دھنیت جلد (Oily Skin) میں مفید ادویہ**

بعض لوگوں کی جلد میں روغنیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ جس کے بیرونی علاج میں حابس ادویہ کا ضماد لگاتے ہیں۔ مثلاً آرد نخود، آرد باقلہ، آرد کرسنا ہمراہ عرق گلاب استعمال کرائیں۔

**بثور لبنیہ (مہاسہ) میں مفید نسخے درج ذیل ہیں۔**

معجون عشبہ 5 گرام صبح شام ہمراہ عرق شاہترہ 25 ملی لیٹر صبح شام دیں۔

بیرونی طور پر کافور، گندھک کا ضماد روغن گل میں ملا کر استعمال کرائیں۔

مذکورہ نسخوں کے علاوہ کھانے کی دواؤں میں سرپھوکہ 4 گرام، چرائتہ 4 گرام، عناب 4 عدد شاہترہ 4 گرام، گل نیم (نیم کا پھول) 4 گرام کو 1 گلاس پانی میں رات میں بھگودیں صبح چھان کر پی لیں۔ انشاء اللہ چہرہ کا رنگ صاف ہوجائے گا اور چہرہ کی سیاہی کم ہوگی اور کیل، مہاسے اور جھائیں سے بھی نجات مل سکے گی۔

□□□

**Dr. Ehsan Rauf**
476/6C Behind Madeh Ganj
Police Chowki, Sitapur Road
Lucknow-226020 (U.P)

# تاثرات: نگر نگر سے

اردو دنیا، فکر و تحقیق اور بچوں کی دنیا کے بعد قومی کونسل نے ایک ماہنامہ 'خواتین دنیا' مارچ 2017 سے شروع کیا ہے۔ 'خواتین دنیا' مکمل طور سے سرکاری رسالہ ہے۔ رسالے کا گیٹ اپ بہت خوبصورت ہے اس میں خواتین سے متعلق ہر شعبے کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے مختلف موضوع میں تقسیم کیا گیا ہے اور بیشتر مضامین خواتین سے ہی تحریر کرائے گئے ہیں۔ رسالے کے اداریہ کو ''مشعل'' کا عنوان دیا گیا ہے۔

مئی 2019 کے اس شمارے میں ''روبرو'' عنوان کے تحت جدید دور کی مشہور ادیبہ و فکشن نگار ڈاکٹر ثروت خان کا عورتوں کے تعلق سے حقانی القاسمی کے ذریعے پیش کیا گیا انٹرویو کافی معلومات افزا ہے۔ اس میں عورتوں کے استحصال اور حقوق کی وکالت کی گئی ہے۔ اس تعلق سے رانی مکھرجی کی فلم مردانی مثال کے طور پر پیش کی گئی ہے۔ شخصیات کے تحت تیرہویں صدی کی مشہور خاتون حکمراں رضیہ سلطان کی پوری زندگی کی جدوجہد اور کارناموں کو پیش کیا گیا ہے۔ پرواز کے نئے آسمان کے عنوان سے صوبہ بہار کے ضلع چمپارن کی پہلی مسلم آئی۔ اے۔ ایس۔ خاتون اور یقین محکم عمل پیہم کی مصداق شفقت آمنہ کی زندگی اور جدوجہد سے بھرپور زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی ہمت، لگن، حوصلے اور وسیع النظری سے آج کی خواتین سبق حاصل کرتے ہوئے اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کرسکتی ہیں۔ وہ اعلیٰ ہمتی اور بلند عزائم کی ایک لامثال خاتون ہیں۔

نکہت سخن کے تحت مشہور شاعرات وحیدہ نسیم، ممتاز مرزا، زاہدہ زیدی، رشیدہ عیاں، سیدہ فرحت، جمیلہ بانو، صغریٰ عالم اور بلقیس ظفیر الحسن کے منتخب اشعار سے اس رسالے کو زینت بخشی گئی ہے۔

جہان نسواں کے عنوان سے خواجہ عبدالمنتقم کا سپریم کورٹ کا ایک حالیہ فیصلہ قلمبند کیا گیا ہے۔ جس میں عورت پر اس کے خاوند یا رشتے داروں کے ذریعے ظلم سے متعلق اس کورٹ کے کلیدی فیصلہ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں کسی عورت پر اس کے خاوند یا خاوند کے رشتے داروں کے ذریعے ظلم کیے جانے اور اسے (Matrimonial home) سسرال / شادی کے بعد جائے رہائش سے نکالے جانے کی صورت میں متاثرہ کسی بھی ایسے مقام پر جہاں وہ گھر سے نکالے جانے کے بعد پناہ لیتی ہے۔ مقامی اختیار سماعت والی عدالت میں مقدمہ دائر کرسکتی ہے۔ یہ فیصلہ سپریم کورٹ نے تعزیرات ہند کی دفعہ 498 الف کے تحت دائر کیے گئے ایک معاملہ میں دیا ہے۔

اسی عنوان کے تحت شمیم احمد صدیقی کے مضمون اردو رباعی میں شرنگار رس اور نسوانی روپ میں مختلف قدیم وجدید شعرا جیسے میر شیر علی افسوس، انشاء اللہ خاں انشاء، انیسویں صدی کے مومن اور امیر مینائی کی رباعیوں سے اشعار پیش کیے گئے ہیں۔

جہان نسواں کے تحت رضیہ پروین کا مضمون جوش ملیح آبادی کی فطری شاعری کے عنوان سے مناظر فطرت کی عکاسی کی گئی ہے۔

اسی سلسلے میں حارث حمزہ لون کا مضمون ''قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کرداروں کا معاشرتی ونفسیاتی مطالعہ'' کافی معلومات افزا ہے جس میں فاضل مضمون نگار نے شعور کی رو کی تکنیک کے حوالے سے مثالیں بھی پیش کیں ہیں۔ اس سلسلے میں میرے بھی صنم خانے، سفینۂ غم

دل، آگ کا دریا، آخر شب کے ہمسفر، گردش رنگ چمن، چاندنی بیگم وغیرہ ناولوں کے کرداروں میں اس تکنیک کو پیش کیا ہے۔ان کے یہاں عورت بہت بیباک اور نڈر نظر آتی ہے۔وہ اپنے حالات سے متصادم بھی ہوتی ہے اور اس پر قابو بھی رکھتی ہے۔عورت اپنی زندگی سے سماج کو تبدیل کرنے کے لیے سرگرم عمل بھی ہے۔اسی سلسلے میں محترمہ عالیہ کا مضمون ''خواتین افسانہ نگاروں میں تانیثی رجحان 1980 کے بعد'' کافی معلومات افزا ہے۔جس میں مضمون نگار نے ''راجندر سنگھ بیدی کی کہانی لاجونتی'' کو پیش کیا ہے۔1980 کے بعد کی دہائیوں میں اردو افسانے میں تانیثی رجحان شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔بالخصوص خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں تحریک نسواں کے افکار و عوامل نظر آتے ہیں۔

اسی عنوان کے تحت سمیہ بانو کا مضمون صغریٰ مہدی کے افسانوں کا فکری کینوس بھی بہترین مضمون ہے۔جس میں ان کے افسانوں کے مجموعے پتھر کا شہزادہ، جو میرے وہ راجہ کے نہیں، پہچان اور پیش گوئی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی سماجی ضرورتوں کے تحت ایسے افسانے لکھے جس میں نئے عہد کے نئے مسائل کے ساتھ ساتھ مثبت اقدار اور روایات کا بھی عکس نظر آتا ہے۔

''کہانیاں'' عنوان کے تحت چار کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔جن میں ڈاکٹر خورشید جہاں کی مدد بنام پبلیسٹی سبق آموز کہانی ہے۔لوگ شہرت اور ناموری کے لیے مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں جب کہ ضرورت مند کی مدد کے لیے بہانے اور حیلہ بنا لیتے ہیں۔چاہے اس شخص کی اس سے کتنی ہی گہری دوستی کیوں نہ ہو۔دوسری کہانی تبسم فاطمہ کی ''دھند اور موسیقی'' ہے۔یہ کہانی بھی حسن اخلاق اور فرض شناسی کی بہترین مثال ہے۔نوکر شکیل اپنی جان کی قربانی دے کر مالکہ کی جان بچا لیتا ہے۔اس لیے کہ اسے اپنی ذمے داری اور فرض شناسی کا احساس رہتا ہے۔وہ اپنے اس کام کو ایسے چھپا کر کرتا ہے جیسے دھند میں موسیقی کہ لوگوں کو بعد میں احساس ہوتا ہے۔چشمہ فاروقی کی کہانی ''غرور اور اعتماد'' بھی نصیحت آمیز کہانی ہے جو ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ ہمیں اپنے اوپر نہ تو فخر و گھمنڈ اور نہ چاپلوسوں پر مکمل اعتماد کرنا چاہیے۔ہمیں مفاد پرست دوستوں کو پہچاننا چاہیے کیونکہ غرور اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔اس کا بدلہ بہت جلد دنیا ہی میں مل جاتا ہے۔

اس عنوان کی آخری اور چوتھی کہانی تبسم آرا کی ''بحث اور انا'' ہے جس میں تسنیم اور عامر کی کہانی پیش کی گئی ہے۔اس میں بحث و مباحثہ اور انا اپنی بات منوانے کی ضد نے شادی کے سلسلے کو ہی ختم کر دیا۔

حسن سخن کے عنوان سے ریحانہ خاتون کی نظم جہیز اور ایک سہاگن کے خواب، مرد کا اعتراف اور انمول بہترین نظمیں ہیں۔اس کے علاوہ میمونہ علی چوگلے کی نظم کلپنا چاؤلہ اور کتابیں بھی بہترین نظموں میں سے ہیں جو خواتین کو آگے بڑھنے کے لیے ہمت و حوصلہ عطا کرتی ہیں۔کتابوں کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا چاہے دنیا کتنی ہی ترقی کر جائے۔

امور خانہ داری میں باورچی خانہ کے عنوان سے لذیذ پکوان سے خواتین مختلف قسم کے پکوان بنانے کی نئی ترتیب و ترکیب سے فائدہ اٹھا کر دوسروں کی ہمت افزائی کر سکتی ہیں۔صحت عنوان کے تحت ''ہماری غذا'' بہترین مضمون ہے۔اس سے ہمیں اپنی غذا کے بارے میں معلومات ہوتی ہے کہ ہمیں کس مقدار میں کیسی غذا لینی چاہیے، جس سے ہماری صحت برقرار رہے۔پھل اور سبزی کا صحت کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ہوتا ہے۔ہمیں مناسب غذا لینی چاہیے تا کہ ہم بیماری سے بچ سکیں اور صحت مند رہ سکیں۔

آرائش و زیبائش کے تحت چہرے اور جلد کی خوبصورتی کے سلسلے میں پیش کیے گئے نسخوں سے خاص طور سے خواتین فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

رسالے کے آخر میں مختلف شہروں سے آئے لوگوں کے تاثرات پیش کیے گئے ہیں۔رسالے کے اختتام پر خبر نامہ کے تحت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی 100 سالہ تاریخ میں پہلی خاتون وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر کے عہدہ سنبھالنے کی خبر سرخیوں میں ہے۔اسی عنوان کے تحت دوسری خوش خبری یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بی۔ٹیک کی طالبات زینت فرحین اور طیبہ باسط اور اسی شعبہ کے اسسٹنٹ پروفیسر مسٹر منیب حسن خاں کو نئی دہلی کے آئی۔سی۔ٹی۔ای آڈیٹوریم میں ڈیجیٹل درسیات کے موضوع پر منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں عمدہ ترین مقالے کی پیشکش پر ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

اس طرح ''خواتین دنیا'' قومی کونسل کا ایک عمدہ اور کارآمد رسالہ ہے۔جس میں عام طور سے خواتین کے تعلق سے مضامین، کہانیاں، خواتین شخصیات، انٹرویو، امور خانہ داری سے متعلق کارآمد نسخے، آرائش و زیبائش کے لوازمات، منتخب اشعار، بہترین موضوع پر نظمیں، خواتین سے متعلق جنسی جرائم کے جو قوانین پیش کیے گئے ہیں وہ بہت ہی کارآمد ہیں۔لذیذ پکوان اور غذا سے متعلق ترکیب و ترتیب خواتین میں کافی دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔تاثرات اور خبر نامہ کے تحت جو خبریں دی گئی ہیں وہ خواتین کی ہمت افزائی کر سکتی ہیں۔ان تمام امور کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کونسل کا یہ رسالہ خواتین کے علاوہ عوام و خواص میں بھی مشہور و معروف ہوگا اور عوامی سطح پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی B1 N/139 ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی

# خواتین خبرنامہ

## دوتی چند نے ہندوستان کو سونے کا تمغہ دلا کر تاریخ رقم کی

نئی دہلی (یو این آئی)، روزنامہ راشٹریہ سہارا، 11 جولائی 2019
کبھی صنفی تنازعہ تو کبھی ہم جنس پرست ہونے کی ذہنی اذیت برداشت

کرنے والی ہندوستانی ایتھلیٹ دوتی چند نے اپنے جذبے اور استقلال کی شاندار مثال پیش کرتے ہوئے اٹلی کے نیپلس میں 30 ویں ورلڈ سمر یونیورسٹی گیمس کے 100 میٹر مقابلہ میں ہندوستان کو پہلا سونے کا تمغہ دلا کر تاریخ رقم کی ہے۔ ہندوستان کو ان کھیلوں میں نہ صرف پہلا تمغہ ملا ہے بلکہ وہ ورلڈ یونیورسٹی گیمس کی تاریخ میں 100 میٹر کی دوڑ میں سونا جیتنے والی پہلی ہندوستانی ہیں۔ اس سے قبل کوئی بھی ہندوستانی ان کھیلوں میں 100 میٹر کی دوڑ کے فائنل میں کبھی کوالیفائی نہیں کر پایا ہے۔ دو مرتبہ کی ایشائی چمپئن اور نیشنل ریکارڈ یافتہ دوتی نے اس سال مئی میں ہی خود کو ہم جنس پرست بتایا تھا جس کے بعد وہ سرخیوں میں آ گئیں۔ ہندوستانی رنر نے اپنا تمغہ جیتنے کے بعد اظہار مسرت کرتے ہوئے اس کی تصویر اور مسکٹ کے فوٹو کو ٹوئٹر پر شیئر کرتے ہوئے لکھا۔ تم مجھے جتنا پیچھے کھینچو گے، میں اتنی ہی مضبوطی سے واپس آؤں گی۔

دوتی کی اس کامیابی پر صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے بھی انھیں مبارک باد پیش کی۔ صدر نے لکھا' آپ کو مبارک باد دوتی یونیورسٹی گیمس میں 100 میٹر ریس میں سونے کا تمغہ جیتنے پر۔' یہ ہندوستان کے لیے ان کھیلوں میں پہلا تمغہ ہے اور ملک کے لیے قابل فخر لمحہ۔ اپنی کوششیں جاری رکھیے اولمپک میں ہم اسی طرح کی جیت کی امید کریں گے۔

ہندوستانی ایتھلیٹ نے 11.32 سکنڈ میں ریس پوری کی اور پہلے مقام پر رہیں۔ ان کے نام 100 میٹر میں 11.24 سکنڈ کا قومی

## طلائی تمغہ جیتنے پر وزیر اعظم نے دوتی چند کو مبارک باد دی

نئی دہلی (یو این آئی)۔ وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے خواتین کی 100 میٹر دوڑ میں فائنل مقابلہ جیتنے پر دوتی چند کو مبارک باد دی ہے۔ انھوں نے اس ایونٹ میں سونے کا تمغہ جیتا ہے۔ وزیر نے کہا کہ "یہ ایک غیر معمولی (ایتھلیٹ کا غیر معمولی کارنامہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ خواتین کی 100 میٹر فائنل دوڑ میں سونے کا تمغہ جیتنے پر دوتی چند کو مبارک باد دیتا ہوں، جنھوں نے سخت محنت اور لگن کے بعد یہ تمغہ جیتا ہے اور جس کی وہ مستحق بھی ہیں۔ وزیر اعظم مودی نے اپنے ٹویٹر پر کہا کہ دوتی چند نے سونے کا تمغہ جیت کر ملک کا نام روشن کیا ہے۔"

ریکارڈ بھی درج ہے۔ دوتی نے لکھا۔ کئی برسوں کی محنت و مشقت اور دعاؤں کی بدولت میں نے ایک بار پھر 100 میٹر سے ورلڈ یونیورسٹی گیمس میں سونے کا تمغہ جیت لیا ہے۔ دوتی نے تمغہ جیتنے کے بعد نامہ نگاروں سے کہا۔ میں یونیورسٹی گیمس میں سونے کا تمغہ جیتنے والی پہلی ہندوستانی بن کر انتہائی خوش ہوں۔ میں اپنے اس تمغہ کو اپنی یونیورسٹی کے آئی آئی ٹی اور اس کے بانی سمنتا جی کو وقف کرنا چاہتی ہوں جنھوں نے ہر مشکل وقت میں میری مدد کی۔ اوڈیشہ کے وزیر اعلیٰ نوین پٹنائک نے بھی میری بہت حمایت کی جس کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں۔ 100 میٹر دوڑ کا چاندی کا تمغہ سوئٹزر لینڈ کی اجیلا ڈیل پونٹے کو ملا جو 11.33 کا وقت لے کر دوسرے نمبر پر رہیں۔ دوتی نے منگل کو سیمی فائنل میں 11.41 سکنڈ کے وقت کے ساتھ فائنل کے لیے کوالیفائی کیا تھا۔ پیر کو مقابلہ کی ہیٹ میں انھوں نے 11.58 سکنڈ کا وقت لے کر سیمی فائنل میں جگہ بنائی تھی۔

## آئی سی سی کے انٹرنیشنل پینل میں پہلی ہندوستانی خاتون ریفری جی ایس لکشمی

8 جولائی 2019، روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی۔ ہندوستان کی جی ایس لکشمی (گنڈی کوٹا سروا لکشمی) کو آئی سی سی میچ ریفری کے بین الاقوامی پینل میں شامل کر لیا گیا ہے وہ بین الاقوامی میچوں میں اپنی خدمت

انجام دینے کی اہل ہیں۔ کلے ری پولوساک مردوں کے ون ڈے انٹرنیشنل میچ میں امپائرنگ کرنے والی پہلی آسٹریلیائی خاتون ہیں۔ گھریلو خواتین کرکٹ میں 09-2008 سے میچ ریفری کا کردار ادا کر رہی 51 سالہ لکشمی اب تک خواتین کے 3 ون ڈے، 3 ٹی ٹوینٹی بین الاقوامی میچ میں ریفری رہ چکی ہیں۔ آئی سی سی کے مطابق لکشمی نے کہا کہ 'آئی سی سی کے انٹرنیشنل پینل میں منتخب کیا جانا میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔'

کرکٹ کے کھیل میں ہندوستان کی بہت سی خواتین نے اپنے جوہر دکھائے ہیں، لیکن ہندوستان کی سابق کرکٹر لکشمی نے بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم اعزاز حاصل کیا ہے۔ اب بین الاقوامی کرکٹ میچ کے ریفری کے طور پر لکشمی کا نام آنا ہندوستان کے لیے باعث فخر ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کرکٹ پر صرف مردوں کی اجارہ داری تھی، پھر خواتین کرکٹ کی شروعات ہوئی، لیکن امپائرین اور ریفری مرد ہی ہوا کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ خواتین نے اس میدان میں بھی اپنے جوہر دکھانا شروع کیے۔ مردوں کے ون ڈے میچوں میں امپائرنگ کے لیے خواتین کو منتخب کیا جانے لگا اور اب لکشمی کو آئی سی سی میچ ریفری کے بین الاقوامی پینل میں شامل کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ جی ایس لکشمی کے مطابق 'امید ہے کہ ایک کھلاڑی اور آفیسر کے بطور اپنے تجربے کا انٹرنیشنل سطح پر اچھا استعمال کروں گی۔' آسٹریلیا کی ایلوئس شیریڈن آئی سی سی کے امپائروں کے 'ڈیولپمنٹ پینل' میں ہم وطن پولوساک کے ساتھ جڑیں گی۔ اس طرح اس پینل میں خواتین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جی ایس لکشمی کے علاوہ لارن ایگن باگ، کم کاٹن، شیوانی مشرا، سوریڈ فرن، میری والڈران اور جیکلن ولیمز اس پینل میں شامل ہیں۔ اس پینل میں شامل ہونے والی پہلی خاتون امپائر کیتی کراس تھیں، جنھوں نے گذشتہ سال ریٹائرمنٹ لے لیا تھا۔ آئی سی سی کے امپائروں اور ریفری شعبہ کے سی منیجر ایڈرین گریفتھ نے کہا کہ 'ہم لکشمی اور ایلوئس کا اپنے پینل میں خیر مقدم کرتے ہیں، جو اس میدان میں خواتین افسران کو آگے بڑھانے میں لیا گیا اہم قدم ہے۔ ان کی ترقی کو دیکھ کر اچھا لگتا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ خواتین ان کے نقش قدم پر چلیں گی۔'

## مہوش شیخ کی ایس ایس سی امتحان میں نمایاں کامیابی

ناسک: (محمد رضا نوری) 8 جولائی، 2019۔ شہر کی سیکریڈ ہارٹ

کانوینٹ اسکول کی طالبہ شیخ مہوش محمد ذاکر نے ایس ایس سی امتحان میں 95 فیصد مارکس حاصل کر کے اسکول میں دوم مقام حاصل کیا۔ بتادیں کہ مہوش شیخ کے والد محمد ذاکر نیشنل اردو ہائی اسکول میں بطور معلم اپنی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جبکہ ان کی بڑی بہن ایم بی بی ایس میں زیر تعلیم ہیں۔ مہوش بھی میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند ہیں۔

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

## ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت

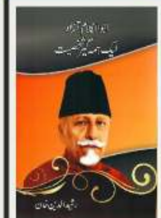

مصنف: رشید الدین خان

صفحات: 684

قیمت: 235 روپے

## فرہنگِ مولانا ابوالکلام آزاد

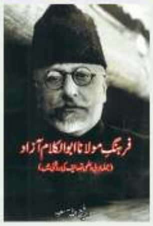


مصنف: رفیع اللہ مسعود

صفحات: 669

قیمت: 290 روپے

## درسِ بلاغت

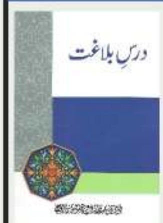


ادارہ

صفحات: 230

قیمت: 85 روپے

## قومی یکجہتی ایک مطالعہ اور تجزیہ

مصنف: ابوسفیان

صفحات: 203

قیمت: 110 روپے

## گوپال متل (مونوگراف)

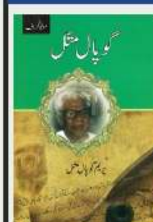


مصنف: پریم گوپال متل

صفحات: 117

قیمت: 80 روپے

## کوثر چاندپوری (مونوگراف)

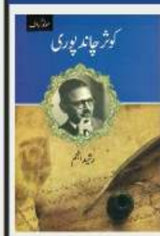


مصنف: رشید انجم

صفحات: 150

قیمت: 90 روپے

## سماجی تحقیق

مصنف: عذرا عابدی

صفحات: 490

قیمت: 215 روپے

## جدید ہندی شاعری پر اردو کا اثر

مصنف: ڈاکٹر نریش

صفحات: 155

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly August 2019 , Vol. 03, Issue: 08 RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

## اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025